دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۸۴ ماہ رجب المرجب ۱۴۳۰ھ مطابق ماہ جولائی ۲۰۰۹ء عدد ۱

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

بحرین ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ اسی نسبت سے وہاں کا سفر بھی مختصر رہا۔ ۱۳/ مئی کی شام گلف ایر سے وہاں پہونچا اور ۱۷/ مئی کی شام مسقط واپسی ہوگئی۔ وہاں چار دن کے قیام کو بھرپور طور پر استعمال کیا گیا۔ بحرین شکیل احمد اعظمی صاحب کی دعوت پر گیا تھا جو میرے پرانے کرم فرما ہیں اور مجھے بھائی کی طرح عزیز ہیں۔ ایک مدت سے بحرین میں مقیم ہیں اور اب وہاں کے شہری ہیں، مدرسۃ الاصلاح کے فیض یافتہ اور ندوۃ العلماء کے فارغ التحصیل ہیں۔ دینی اور سماجی کاموں کے علاوہ جن میں وہ ہمیشہ سے دلچسپی لیتے رہے ہیں اس وقت ان کی خاص شناخت تعلیم کے میدان میں ہے۔ ابن الہیثم اسلامی اسکول بحرین میں ابتدائی تعلیم کے میدان میں اپنا ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ یہ CBSE سے منظور شدہ ایک ہائر سکینڈری اسکول ہے۔ اپنے انتظامات اور کارکردگی دونوں لحاظ سے ایک معیاری درس گاہ ہے۔ شکیل احمد اعظمی صاحب اس کے بانی سربراہ ہیں۔ بحرین کے لیے پہلے سے یہ پروگرام طے تھا کہ وہاں کے مختصر قیام کے دوران اکیڈمی کا ممکنہ حد تک تعارف کرادیا جائے اور یہ پیغام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی جائے۔ اس کے بعد کا کام حالات، مصالح اور سہولت کے لحاظ سے ہوتا رہے گا۔ کام کا ایک مفصل خاکہ پہلے سے مرتب تھا۔ اس مقصد کے پیش نظر متعدد پروگراموں کا اہتمام کیا گیا۔ جن میں سے زیادہ تر کا انعقاد ابن الہیثم اسلامی اسکول کے کشادہ ہال میں ہوا۔ باقی دارالایمان اور دوسری جگہوں پر منعقد ہوئے۔ ان میں سے بعض براہ راست دارالمصنّفین سے متعلق تھے جب کہ بعض کا تعلق دوسرے علمی اور دینی موضوعات سے تھا لیکن ان سب کو بھی اکیڈمی کے تعارف کے لیے استعمال کیا گیا۔ شکیل اعظمی صاحب کے وسیع تعلقات اور انتظامی صلاحیت نے ان پروگراموں کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔ اس مہم میں شکیل احمد اعظمی صاحب کے علاوہ جن بزرگوں اور دوستوں کا تعاون حاصل رہا ان میں عبدالقدوس خاں صاحب، سید خلیق الرحمٰن صاحب، ڈاکٹر محمد طیب صاحب، ندیم احمد صاحب، شکیل احمد صاحب (صبر حد) اور قاری علیم الرحمٰن صاحب کے اسماء گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ عزیزی محمد دانش اعظمی اور ان کے دوستوں نے بحرین کے قیام کو خوش گوار اور آرام دہ بنانے میں کوئی کمی اٹھا نہیں رکھی۔

میرے کرم فرما پروفیسر قاضی مظہر علی صاحب ان دنوں مادر علمی سے طویل رخصت پر ہیں اور یونیورسٹی آف بحرین سے وابستہ ہیں۔ گذشتہ کئی سال سے علی گڑھ الومنی ایسوسی ایشن بحرین کے صدر ہیں۔ ان کے یہاں کھانے پر کئی علیگ اور دوسرے احباب سے ملاقات اور تبادلہ خیالات کا موقع ملا۔ اسی دن سہ پہر میں بحرین کی علیگ برادری نے پارا ڈائز ہوٹل میں ایک استقبالیہ کا اہتمام کیا۔ ہوٹل کے انتخاب میں بھی شاید علی گڑھ سے وابستہ یادوں کا دخل تھا۔ یادش بخیر گذرے وقتوں میں سلیمان ہال کے سامنے پاراڈائز ہوٹل ہی یونیورسٹی ایریا میں ایک ایسی جگہ تھی جہاں صاف ستھرے ماحول میں چائے کا لطف لیا جاسکتا تھا۔ فطری طور پر زیادہ باتیں دارالمصنّفین سے متعلق ہوئیں۔ شرکاء، دارالمصنّفین اور اس کی خدمات سے واقف اور اس کے قدر شناس تھے۔ اس وجہ سے اس کے موجودہ حالات سے فکر منداور اصلاح احوال کے آرزومند تھے۔ مفید مشورے اور تجاویز سامنے آئیں۔ اس کے علاوہ بنیادی اسلامی مآخذ پر مشتمل ڈی۔ وی۔ ڈی اور سی۔ ڈی بطور تحفہ اکیڈمی کی لائبریری کے لیے موصول ہوئیں۔ ان مصروفیات کے درمیان شکیل اعظمی صاحب کی توجہ سے بعض علمی اداروں کی زیارت اور ان کے ذمہ داروں سے ملاقات اور تبادلہ خیال کا موقع ملا۔ ان میں عرب اوپن یونیورسٹی کے ڈائرکٹر، ڈسکوراسلام کے جنرل منیجر جناب خالد عبدالسلام اور یونیورسٹی آف بحرین میں اسلامیات اور عربی کے صدر شعبہ ڈاکٹر فرید محمد ہادی شامل ہیں۔ ان سب نے دارالمصنّفین کے سلسلہ میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا اور آئندہ کسی موقع پر اس کی زیارت کی خواہش ظاہر کی۔

منیر خاں صاحب مسقط میں ایک بڑی پینٹس کمپنی کے جنرل منیجر ہیں۔ دینی دردا ور حسّاس دل رکھتے ہیں۔ دینی، اصلاحی اور دعوتی کاموں میں پیش پیش رہتے ہیں اور متعدد دینی اداروں سے فیض رسانی کا تعلق رکھتے ہیں۔ خاکسار راقم حروف سے ان کا تعلق پرانا ہے۔ ادارہ علوم القرآن کی کوششوں میں پہلے سے شریک ہیں اور اس کے بعض اہم پروگرام ان کی توجہ اور دلچسپی کے رہین منت ہیں۔ مسقط میں دارالمصنّفین کے تعارف کا کام بنیادی طور پر انہی کے ذریعہ انجام پایا۔ اس سلسلہ کا ایک اہم پروگرام ان کے گھر پر ہوا۔ انہوں نے کچھ منتخب لوگوں کو کھانے پر مدعو کیا۔ ان حضرات کے ساتھ دارالمصنّفین کے مسائل کے سلسلہ میں طویل، مثبت اور تعمیری گفتگو ہوئی۔ مسقط میں جن حضرات نے دارالمصنّفین کے معاملات میں خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا، اپنے مشوروں سے نوازا اور عملی تعاون سے بھی دریغ نہیں کیا ان میں فیروز زری والا

صاحب، امیر احمد صاحب، مصطفیٰ صاحب اور سراج الدین صاحب شامل ہیں۔ منیر خاں صاحب نے ایک اسکالرشپ اسپانسر کرنے کے علاوہ سیرت پاک پر ایک معیاری سالانہ سمینار کی تجویز پیش کی اور اس کے لیے ضروری وسائل فراہم کرنے کی پیشکش کی۔ سیرت پاک مسلمانوں کے لیے اسوۂ حسنہ ہے اور یہ دارالمصنّفین کا اختصاص بھی ہے۔ قرآن مجید پر ایک معیاری سیمنار کی روایت قائم کرنے کی کوشش ادارہ علوم القرآن کر رہا ہے۔ سیرت پر ایک معیاری سیمنار کی ضرورت باقی تھی جو بجا طور پر دارالمصنّفین کے حصہ میں آئی۔ کوشش یہی ہوگی کہ اس سیمینار کا سلسلہ اسی سال شروع ہوجائے۔ یہ دونوں سیمینار منیر خاں صاحب کے حسنات میں شامل ہیں۔ ایس۔ ایم۔ انور صاحب، سابق صدر اسٹوڈنٹس یونین، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ان دنوں نزوہ میں انگریزی کے استاذ ہیں۔ انہیں دارالمصنّفین سے بڑا گہرا قلبی تعلق ہے۔ ان کے ساتھ دارالمصنّفین کے تعارف کا پروگرام تھا لیکن بعدِ مسافت اور میرے قیام مسقط کے دوران ان کی کچھ اضافی مصروفیات اور کچھ میری اپنی مجبوریاں اس راہ میں حائل رہیں۔ میں ان کا ممنون کرم ہوں کہ میری واپسی کے دن وہ کسی طرح وقت نکال کر اور طویل فاصلہ طے کر کے مجھ سے ملنے کے لیے ایرپورٹ تشریف لائے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام بزرگوں اور عزیزوں کو جنھوں نے دارالمصنّفین کے معاملات میں دلچسپی لی۔ دامے، درمے، قدمے، سخنے تعاون کیا اور دارالمصنّفین کے اس خادم کے ساتھ نوازش کا معاملہ کیا اس کا بہترین اجر دے۔ آمین۔

یہ سفر بنیادی طور پر ایک تعارفی سفر تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہ مقصد بڑی حد تک حاصل ہوا۔ اس کے نتیجہ میں اس خطہ کے سنجیدہ حلقوں میں جہاں تک ہماری رسائی ہوسکی، اب دارالمصنّفین کی خدمات اور اس کے موجودہ حالات توجہ اور گفتگو کے موضوع بن چکے ہیں۔ مزید برآں اس کے نتیجہ پر اتنے اسباب و وسائل فراہم ہونے کی سبیل بھی پیدا ہوئی جو کم از کم فوری اور ناگزیر ضروریات کی کسی حد تک کفالت کرسکیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل عمیم سے امید ہے کہ اس سفر کے دوررس نتائج برآمد ہوں گے۔ دارالمصنّفین کا احیاء، اس کی عظمت رفتہ کی بازیافت اور اس کو اکیسویں صدی کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کرنے کا کام ایک طویل مدتی اور صبر آزما کام ہے اور اس کے لیے وسیع مالی اور انسانی وسائل کی ضرورت ہے۔ دارالمصنّفین کے قدر شناس اگر اس طرف تھوڑی سی توجہ دیں تو اس راہ کی مشکلات آسان ہوسکتی ہیں۔ اور یہ کارواں پھر سرگرم سفر ہوسکتا ہے۔

مقالات

سائنسی تحقیقات کا اسلامی پس منظر

ڈاکٹر خواجہ محمد سعید

(۲)

کائنات کی تخلیق کے بارے میں تین طرح کے نظریات پائے جاتے ہیں، ایک نظریہ یہ کہ اس کائنات کو ایک اللہ رب العزت نے پیدا کیا اور وہی اس کے تمام نظام کو چلا رہا ہے، مادیت پرستوں کا خیال ہے کہ یہ کائنات مادہ سے معرض وجود میں آئی، سائنس زدہ ذہن کا خیال ہے کہ اس کائنات کی ابتدا توانائی (Energy) سے ہوئی، قانون بقائے توانائی کے تحت:

"توانائی کو نہ بنایا جاسکتا ہے اور نہ ہی فنا کیا جاسکتا، البتہ یہ ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتی ہے، Energy can neither be created nor destroy but it change from one form to another form".

اب اگر ایک سائنس زدہ ذہن کو اسی کی زبان میں یہ سمجھنا ہو کہ اس کائنات کو ایک اللہ رب العزت نے تخلیق کیا تو ہم اس کو قانون بقائے توانائی کی زبان میں یوں سمجھا سکتے ہیں کہ:

"اللہ کو نہ پیدا کیا جاسکتا اور نہ فنا کیا جاسکتا ہے، البتہ وہ ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتا ہے، Allah (God) can neither created nor destroy but change from one form to another form".

اس تعریف میں پہلا حصہ بالکل قرآن کے مطابق ہے کہ اللہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا لیکن اس تعریف کے دوسرے حصے میں بہ ظاہر ایک گستاخی کا عنصر معلوم ہوتا ہے مگر ایسا نہیں، سورۂ رحمٰن میں ارشاد ربانی ہے کہ:

شعبۂ فلسفہ، جامعہ پنجاب، لاہور۔

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ (القرآن ۵۵: ۲۹) ہر آن اس کی شان نرالی ہے۔

یہ تغیر و تبدل دراصل اس کی ذات کا نہیں بلکہ اس کی صفات کا ہے، ایک ہی لمحے وہ رحمٰن اور رحیم ہے اور قہار و جبار بھی ہے، ہر آن اس کی صفات بدلتی رہتی ہیں، قانون کا یہ حصہ سب سے پہلے اللہ کی موجودگی کا اقرار کرتا ہے اور سیکولرازم کو جھٹلاتا ہے کیوں کہ تبدیلی اسی شئے میں ہوسکتی ہے جو موجود ہو اگر کوئی شئے موجود ہی نہیں تو اس میں تبدیلی کیا ہوگی، اللہ کی حالت میں تبدیلی اللہ کے وجود کو ثابت کرتی ہے، یہاں اس حالت سے مراد خواص ہیں یعنی اگر اللہ تعالیٰ ایک حالت میں بارش برساتا ہے تو دوسری حالت میں قحط بھی لاسکتا ہے، یعنی یہ خواص ایک ہی اللہ کے ہیں اور ایک ہی اللہ ان خواص کو بدل بدل کر استعمال کرتا ہے، جس طرح توانائی، شمسی توانائی سے برقی توانائی، برقی توانائی سے حرارتی توانائی، حرارتی توانائی سے مخفی توانائی اور مخفی توانائی سے حرارتی توانائی میں تبدیل ہوسکتی ہے لیکن ان سب کی بنیاد ایک ہی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے خواص ان گنت ہیں مگر ان سب کی بنیاد ایک ہی اللہ ہے، اگر ایک سے زیادہ اللہ ہوتے تو پھر یہ حالتیں تبدیل نہ ہوتیں کیوں کہ پھر ہر خدا کی ایک مستقل مخصوص حالت یا خواص ہوتے، جیسا کہ دیگر مذاہب میں حسن کا دیوتا، محبت کا دیوتا، رزق کا دیوتا، بارش کا دیوتا، نہ جانے کون کون سے خدا مانے جاتے ہیں جب کہ اسلامی رو سے ایک اللہ ہی ان حالتوں یا خواص کو تبدیل کر کے استعمال میں لاتا ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے کہ:

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِى الْمُلْكَ	کہو کہ اے اللہ اے بادشاہی کے مالک تو جس کو
مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ	چاہے بادشاہی بخشے اور جس سے چاہے بادشاہی
وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ	چھین لے اور جس کو چاہے عزت دے اور جسے
بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ	چاہے ذلیل کرے، ہر طرح کی بھلائی تیرے ہی
قَدِيْرٌ (القرآن ۳: ۲۶)	ہاتھ ہے اور بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

یعنی ایک حالت میں اللہ تعالیٰ عزت دے رہا ہے اور اس کی مخالف حالت میں (یعنی حالت کو تبدیل کر کے) اللہ تعالیٰ ذلت دے رہا ہے، چنانچہ قانون کا یہ حصہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت یا عقیدۂ توحید کا اقرار کرتا ہے، اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ قانون بقائے توانائی اللہ تعالیٰ کی درج ذیل

خصوصیات بیان کرتا ہے:

۱- اللہ ہمیشہ سے ہے۔ ۲- اللہ ہمیشہ رہے گا۔ ۳- اللہ کے نہ کوئی والدین ہیں اور نہ کوئی اولاد۔ ۴- اللہ موجود ہے اور وحدہ لاشریک ہے۔

ارشاد ربانی ہے کہ:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (القرآن ۱۱۲:۱-۴)

کہو وہ اللہ ہے، یکتا، اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں، نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔

آج کی سائنس Preservation کی بات کرتی ہے، چیزوں کو کافی عرصہ تک محفوظ رکھنے کے لیے سائنسی طریقے اپنائے جاتے ہیں، قرآن پاک نے صدیوں پہلے اس عمل کا ذکر کر دیا ہے، ارشاد ربانی ہے کہ:

فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ (القرآن ۲: ۲۵۹)

اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ اتنی مدت میں مطلق سڑی بسی نہیں۔

کھانے پینے کی چیزوں کا خراب نہ ہونا کوئی ایسا معجزہ نہیں بلکہ موجودہ دور میں بھی ماہرین کھانے پینے کی چیزوں کو اس انداز سے ڈبوں میں بند کرتے ہیں کہ وہ سالہا سال تک خراب نہیں ہوتیں، قرآن پاک میں فرعون کے بارے میں فرمایا کہ ہم اس کو دنیا کے لیے عبرت بنائیں گے، آج فرعون مصر میں preserve ہوا پڑا ہے، ارشاد ربانی ہے کہ:

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ (القرآن ۱۰: ۹۲)

تو آج ہم تیرے بدن کو دریا سے نکالیں گے تا کہ تو پچھلوں کے لیے عبرت ہو اور بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے بے خبر ہیں۔

سائنس کی تحقیق سے ایمان زیادہ مضبوط ہوتا ہے، اس کی مثال حضرت ابراہیمؑ کی ہے جنھوں نے مظاہر فطرت سے اپنے رب کی وحدانیت کا اقرار کیا، ان کے سامنے کائنات کا حسن و جمال تھا، حضرت ابراہیمؑ کو ان میں سے ایک معبود کا انتخاب کرنا تھا، جب پوری طرح مظاہر فطرت کا مطالعہ کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ ''اِنِّیْ لَا اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ'' میں غروب ہونے والے

مظاہر کی پرستش نہیں کرسکتا، اسی طرح قرآن پاک نے مشاہدہ اور تجربے کے علم پر بھی زور دیا ہے، حضرت ابراہیمؑ نے اللہ رب العزت سے عرض کی کہ میرے رب تو مردہ سے زندہ کو کیسے نکالے گا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا تم کو یقین نہیں، عرض کی اطمینان قلب چاہتا ہوں، ارشاد ربانی ہے کہ:

وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَلٰـكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا وَاعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔
(القرآن ۲: ۲۶۰)

اور جب ابراہیم نے اللہ سے کہا کہ پروردگار مجھے دکھا کہ مردوں کو کیوں کر زندہ کرے گا، اللہ نے فرمایا کہ تم نے اس بات کو باور نہیں کیا، انہوں نے کہا کیوں نہیں لیکن میں دیکھنا اس لیے چاہتا ہوں کہ میرا دل اطمینان کامل حاصل کرلے، اللہ نے فرمایا کہ چار جانور پکڑ اپنے پاس منگا لو اور ٹکڑے ٹکڑے کرادو پھر ان کا ایک ٹکڑا ہر ایک پہاڑ پر رکھ دو پھر ان کو بلاؤ تو وہ تمہارے پاس دوڑتے چلے آئیں گے اور جان رکھو کہ اللہ غالب اور صاحب حکمت ہے۔

انسان کو علم مختلف ذرائع سے ملتا ہے مظاہر فطرت بھی علم کا بڑا ذریعہ ہیں، پانی، زمین، ہوا، نباتات، حیاتیات گویا کائنات کا ہر مظہر اپنے اندر ایک پوری کائنات سموئے ہوئے ہے، سعدی نے کہا تھا:

برگ درختاں سبز پیش خداوند ہوش
ہر ورقی ایست معرفت کردگار

درخت کے ایک پتے کے اندر بھی ایک پوری کائنات ہے، اس کا نظام بھی بڑا عجیب ہے، اس میں نیچے Stomata ہوتے ہیں جو فضا سے کاربن ڈائی آکسائڈ جذب کرتے ہیں اور فضا میں آکسیجن خارج کرتے ہیں، اس کے علاوہ پتے میں کلورفل ہوتی ہے جس کی وجہ سے پتے کا رنگ سبز ہوتا ہے، یہ درخت کو خوراک بنانے میں مددگار ہوتی ہے، یہ سارا نظام ایک ایسی ترتیب میں ہوتا ہے کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے، پتوں کے ایک ملی میٹر میں ایک مکمل نظام

ہے Stomata پتے کے نیچے والے حصے میں ہوتے ہیں، اس طرح سورج کی شعاعیں ان کے افعال کو متاثر نہیں کرتی ہیں، مسام سے پانی کا اخراج ہوتا ہے جو فضا کے درجۂ حرارت کو توازن میں رکھتا ہے، اس کے علاوہ فضا میں آکسیجن کے توازن کو برقرار رکھنا بھی ان کے افعال میں شامل ہے جو شخص اس تحقیق کے بارے میں علم رکھتا ہے، اس کا ایمان زیادہ پختہ ہوجاتا ہے، سائنس نے ابھی تک یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس نے پتا بنالیا ہے بلکہ اس نے خالق کائنات کی بنائی ہوئی چیزوں پر تحقیق کی ہے اور انسان کو اس چیز کے بارے میں معلومات دیں جو وہ نہیں جانتا تھا، ارشاد ربانی ہے:

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ ۔ اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اس کو علم نہ تھا۔
(القرآن ۹۶:۵)

یقیناً قرآن طب کی کتاب نہیں یہ مادی اور روحانی حوالے سے انسان کے لیے ہدایت کی کتاب ہے لیکن اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اللہ رب العزت نے قرآن کو اہل ایمان کے لیے شفا اور رحمت قرار دیا ہے، ارشاد ربانی ہے کہ:

وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ آيَاتُهٗ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا هُدًى وَّ شِفَآءٌ وَّالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْ آذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّ هُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ۔
(القرآن ۴۱: ۴۴)

اور اگر ہم اس قرآن کو غیر زبان میں نازل کرتے تو یہ لوگ کہتے کہ اس کی آیتیں ہماری زبان میں کیوں کھول کر بیان نہیں کی گئیں، کیا خوب کہ قرآن تو عجمی اور مخاطب عربی، کہہ دو کہ جو ایمان لاتے ہیں ان کے لیے یہ ہدایت اور شفا ہے اور جو ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں گرانی یعنی بہرا پن ہے اور یہ ان کے حق میں موجب نابینائی ہے، گرانی کے سبب ان کو گویا دور جگہ سے آواز دی جاتی ہے۔

انسان اس دنیا میں اللہ رب العزت کا خلیفہ ہے جہاں اس کو یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ ذمہ دار ہے، انسان جسم اور روح سے مرکب ہے، اس کا جسمانی اور روحانی طور پر صحت مند ہونا ضروری ہے، حدیث پاک میں ہے کہ:

''اللہ کی نظر میں ایک قوی مومن کم زور مومن کے مقابلے میں بہتر اور
پسندیدہ ہے''۔(۱)

اس حدیث میں اس بات پر زور دیا گیا کہ انسان کو اپنی صحت کا خیال رکھنا چاہیے لیکن صحت سے مراد بیماری یا ضعف سے بچنا ہی نہیں بلکہ اس سے مراد جسمانی ، روحانی اور سماجی آسودگی ہے، ہم عموماً اپنی صحت کو برقرار رکھنے کے لیے صحت بخش غذائیں اور مشروبات استعمال کرتے ہیں اور ان تمام چیزوں سے پرہیز کرتے ہیں جو ہماری صحت کے لیے مضر ہیں، صحت بخش غذا کا ذکر قرآن پاک میں بھی ملتا ہے، ارشاد ربانی ہے کہ:

يَا اَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِى الْاَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا ـ (القرآن ۲: ۱۶۸)

لوگو! جو چیزیں زمین پر حلال طیب ہیں وہ کھاؤ۔

اس کے علاوہ وہ غذائیں جو صحت کے لیے مضر ہیں قرآن ان سے بچنے کی ہدایت کرتا ہے، ارشاد ربانی ہے کہ:

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ـ (القرآن ۲: ۱۷۳)

اس نے تم پر مرا ہوا جانور اور لہو اور سور کا گوشت اور جس چیز پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے حرام کر دیا ہے، ہاں جو ناچار ہو جائے بشرطیکہ اللہ کی نافرمانی نہ کرے اور حد ضرورت سے باہر نہ نکل جائے اس پر کچھ گناہ نہیں بے شک اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اسلام کے علاوہ یہودیت میں بھی خنزیر کا گوشت کھانا حرام قرار دیا گیا ہے، حرام قرار دینے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ صحت کے لیے مضر ہے، اس کا گوشت کھانے سے انسان کے جسم میں یوریا کی مقدار بڑھ جاتی ہے جو مضر صحت ہے، انسان اپنے جسم سے ۹۸ فیصد یوریا خارج کرتا ہے اور وہ جسم کے لیے ضروری ہے لیکن سور صرف دو فیصد خارج کرتا ہے اس طرح اس کے گوشت میں یوریا کی مقدار زیادہ ہوتی ہے، اسی طرح مشروبات میں شراب کی ممانعت کی گئی ہے، اگرچہ قرآن پاک کے مطابق اس میں انسان کے لیے تھوڑا فائدہ بھی ہے لیکن اس کا نقصان

زیادہ ہے، اس کے استعمال کو صحت کے لیے مضر قرار دیا گیا ہے، ارشاد ربانی ہے کہ:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا ۔ (القرآن ۲: ۲۱۹)

وہ تم سے شراب اور جوا کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دو ان دونوں میں لوگوں کے لیے بڑی خرابی ہے، گرچہ ان میں کچھ منافع بھی ہیں مگر ان کا گناہ ان کے فائدہ سے بہت زیادہ ہے۔

اسی طرح ارشاد خداوندی ہے کہ:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ، اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۔ (القرآن ۵: ۹۰-۹۱)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہ شراب اور جوا، یہ آستانے اور پانسے سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو، امید ہے تمہیں فلاح نصیب ہوگی، شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوے کے ذریعہ سے تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمہیں اللہ کی یاد اور نماز سے روک دے، پھر کیا تم ان سے باز رہو گے۔

موجودہ سائنس نے ثابت کیا ہے کہ شراب کے انسانی صحت پر مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں، مثلاً شراب کے استعمال سے انسان کا دل، جگر اور گردے متاثر ہوتے ہیں، اس کے علاوہ اعصابی نظام بھی متاثر ہوتا ہے، اس کا استعمال عدم تحفظ، بے چارگی اور ذہنی افسردگی اور پھر خودکشی کا باعث ہے، اس کو روکنے کے لیے قرآن پاک لوگوں کو اللہ کی پناہ طلب کرنے کی تعلیم دیتا ہے، ارشاد ربانی ہے کہ:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۔ (القرآن ۱۳: ۲۸)

اور سن رکھو کہ اللہ کی یاد سے دل آرام پاتے ہیں۔

مولانا روم حلال وحرام غذا کے جسمانی وروحانی اثرات کے قائل ہیں، ان کا خیال ہے

کہ جسم پر غذا کے دو قسم کے اثرات ہوتے ہیں، اگر کوئی شقی جسمانی لحاظ سے قوی اور تندرست ہے اور ایسی غذا کھاتا ہے جو صحت وقوت آفریں ہے تو شقی ہونے کے باوجود اس کو اس غذا سے جسمانی فائدہ پہنچے گا لیکن انسان کی ماہیت جسم نہیں بلکہ روح ہے جو غذا کو اس نظر سے دیکھتی ہے کہ یہ حلال طریقے سے روزی حاصل کی گئی ہے یا بے ایمانی اور ظلم سے، مولانا فرماتے ہیں کہ حلال وحرام کا انسان کی روح پر براہ راست اثر ہوتا ہے، حلال کی روزی جو ایمان داری اور محنت سے حاصل کی گئی ہے اس سے انسان کے علم وحکمت میں اضافہ ہوتا ہے، عشق حقیقی اور رقت پیدا ہوتی ہے، حرام کی روزی سے حسد وبغض اور جہالت میں اضافہ ہوتا ہے، روزی ایک تخم ہے اور خیالات اس کا ثمر ہیں، حرام کی روزی سے خراب خیالات پیدا ہوتے ہیں جب کسی شخص کے دل میں خراب خیالات اور خراب میلانات دیکھو تو سمجھ لو کہ یہ حرام کا لقمہ کھاتا ہے، فرماتے ہیں کہ:

لقمہ کاں نور افزود و کمال آں بود آوردہ از کسب حلال
روغنے کاید چراغ ما کشد آب خوانش، چوں چراغے را کشد
علم و حکمت زاید از لقمہ حلال عشق و رقت زاید از لقمہ حلال
چوں ز لقمہ تو حسد بینی دوام جہل وغفلت زاید، آں راداں حرام
لقمہ تخم است و برش اندیشہا لقمہ بحر و گوہرش اندیشہا
زہد از لقمہ حلال اے مہ حضور دردل پاک توو دردیدہ نور (۲)

اسی طرح علم طب میں غذاؤں کے استعمال کی مقدار اور طریقہ استعمال کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، بوعلی سینا نے اس اصول کو ایک قطعہ کی صورت میں بیان کیا ہے:

جمیع الطب فی بیتین درج و حسن القول فی قصر الکلام

پورا فن طب دو اشعار میں درج ہے اور کلام کی خوبی اختصار کلام میں ہے۔

فقلل ان اکلت وبعد اکل تجنب والشفاء فی الاھتضام

اگر کھانا کھاؤ تو کم کھاؤ، کھانے کے بعد کھانے سے بچو کیوں کہ صحت غذا ہضم ہونے میں ہے۔

ولیس علی النفوس اشد من ادخال الطعام علی الطعام

نفوس پر اس سے سخت کوئی دوسری چیز نہیں ہے کہ غذا پر غذا کھائی جائے۔

اسلام اجتماعیت کی بات کرتا ہے، ایک روایت کے مطابق نبی پاکؐ نے فرمایا کہ:

''امت کے تمام ارکان ایک جسم کے مانند ہیں، اگر اس کے کسی عضو میں تکلیف ہوتی ہے تو اس درد کا احساس بقیہ پورے جسم کو بھی ہوتا ہے''۔(۳)

اسلامی رسمیں اجتماعیت کا درس ہیں، مثلاً اسلام میں شادی کا حکم ہے تا کہ اپنی بیویوں کے پاس سکون، اطمینان اور راحت محسوس کریں، زکوٰۃ سے مسلم معاشرے میں کسی فرد کو معاشی دشواریوں کا سامنا نہ کرنا پڑے، قرآن پاک مسلمانوں کو ذاتی صحت کے حوالے سے باشعور رہنے کی ہدایت کرتا ہے، مسلمانوں کو پانچ وقت کی نمازوں سے پہلے وضو کا حکم ہے، وضو میں جن اعضاء کو دھونے کا حکم ہے وہ ایسے اعضاء ہیں جو کھلے رہتے ہیں، جدید سائنسی تحقیقات کے مطابق کوڑھ (جذام) کی بیماری کے جراثیم ناک اور کان میں پرورش پاتے ہیں، وضو کے دوران ان اعضاء کو دھونے سے اس بیماری کا خطرہ نہیں رہتا ہے، اسی طرح قرآن نے مباشرت کے بعد غسل کو واجب قرار دیا ہے، اگر غسل نہ کیا جائے تو سوزاک جیسے خطرناک مرض کا خطرہ رہتا ہے، اس لیے جسم کا دھونا اور غسل کرنا قرآن پاک کی رو سے فرض قرار دیا گیا ہے اور طبی طور پر بھی یہ بات ثابت ہے کہ جسم کو طہارت و پاکیزگی انسانی بدن کو مختلف متعدی امراض سے محفوظ کر کے تندرست و توانا بناتی ہے، غسل سے جلد کے مواد فاسدہ کا اخراج بھی ہوتا ہے اور اعضاء کی غذائیت اور قوت میں اضافہ ہوتا ہے، قرآن پاک نے سورۃ الاسرا آیت نمبر ۳۲ میں زنا کی ممانعت ان الفاظ میں کی ہے (وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَاءَ سَبِيْلًا) اور زنا کے قریب نہ جاؤ کیوں کہ یہ کھلی ہوئی بے حیائی اور نہایت بری راہ ہے، علم طب کی رو سے بدکار عورتوں کے ساتھ زنا کرنا بہت سے امراض کا موجب بنتا ہے، اس لیے کہ بدکار عورتیں سوزاک و آتشک وغیرہ میں عموماً مبتلا ہوتی ہیں اور اس بنا پر ان کے ساتھ مباشرت کرنے والے بھی ان امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں، دور حاضر میں ''ایڈز'' جیسے مہلک مرض کا سبب زنا کاری قرار دیا گیا ہے، جس کے نتیجے میں انسان کے جسم میں قوت مدافعت ختم ہو جاتی ہے اور انسان جلد فوت ہو جاتا ہے، ارشاد ربانی ہے کہ:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى مومنو! جب نماز پڑھنے کا قصد کیا کرو تو منہ اور

الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِنْهُ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۔

(القرآن ۵:۶)

کہنیوں تک ہاتھ دھولیا کرو اور سر کا مسح کرلیا کرو اور ٹخنوں تک پاؤں دھولیا کرو اور اگر نہانے کی حاجت ہو تو نہا کر پاک ہوجایا کرو اور اگر بیمار ہو یا سفر میں ہو یا کوئی تم میں سے بیت الخلا سے ہوکر آیا ہو یا تم عورتوں سے ہم بستر ہوئے اور تمہیں پانی نہ مل سکے تو پاک مٹی لو اور اس سے منہ اور ہاتھوں کا مسح یعنی تیمّم کرلو، اللہ تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں کرنا چاہتا بلکہ یہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کرے تاکہ تم شکر کرو۔

اس آیت میں پانی اور مٹی دونوں سے پاک ہونے کے عمل کا ذکر ہے، عام انسان کے ذہن میں پانی سے پاک ہونے کا مطلب واضح ہے مگر مٹی سے پاک ہونے کا عمل ذرا مبہم ہے لیکن جو لوگ سائنسی علم کے بارے میں واقفیت رکھتے ہیں ان کو معلوم ہے کہ زمین کی سطح پر پائے جانے والے عناصر میں ایک عنصر سلفر بھی ہے، یہ عنصر جراثیم کش ہے، تیمّم میں مٹی کے استعمال سے پاک ہونے کی یہی وجہ ہے کہ ہاتھ جن کا استعمال ہر جگہ ہوتا ہے ان پر جراثیم کے کثرت سے موجود ہونے کا خدشہ بھی زیادہ ہوتا ہے، جب ہم تیمّم کرتے ہیں تو مٹی میں جو سلفر ہوتا ہے وہ ان جرثوموں کی ہلاکت کا سبب بنتا ہے، وضو سے خون کے دباؤ میں بھی سکون ملتا ہے۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ صحت زندگی کی فطری حالت ہے جب کہ بیماری غیر فطری حالت ہے جو انسانی جسم کو اذیت پہنچاتی ہے لیکن مسلمانوں کا نظریہ ہے کہ بیماری اللہ رب العزت کی طرف سے امتحان اور آزمائش ہے جو درحقیقت گناہوں کا کفارہ ہے، ایک روایت کے مطابق نبی پاکؐ نے فرمایا کہ:

''جب بھی کسی بندۂ مومن کو کوئی تکلیف، دشواری، بیماری، رنج و غم حتیٰ کہ ذہنی افسردگی ہوتی ہے تو اس کے بدلے اس کے گناہ دھودئے جاتے ہیں''۔(۴)

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ بیماری کی حالت میں علاج کروانا ضروری ہے، اس کا اشارہ بھی قرآن پاک سے ملتا ہے کہ شہد کی مکھی کے ذریعہ حاصل شدہ شہد کو شفا بخش کہا گیا ہے، ارشاد ربانی ہے کہ:

ثُمَّ كُلِىْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِىْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۔ (القرآن ۱۶:۶۹)	اور ہر قسم کے میوے کھا اور اپنے پروردگار کے راستوں پر چلی جا، اس کے پیٹ سے پینے کی چیز نکلتی ہے جس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں، اس میں لوگوں کے کئی امراض کی شفا ہے، بے شک سوچنے والوں کے لیے اس میں بھی نشانی ہے۔

آج کل کسی بیماری کے علاج کے لیے انٹی بائیٹک استعمال کی جاتی ہے، شہد کی مکھی جب شہد تیار کرلیتی ہے تو پھولوں سے ایک خاص قسم کا رس چوس کر اس سے ایک انٹی بائیٹک تیار کرتی ہے، اس کو شہد کے باہر لگادیتی ہے تاکہ اس میں جراثیم شامل نہ ہوسکیں، اسی وجہ سے شہد میں شفاء ہے۔

جب کبھی صحابہؓ بیمار پڑجاتے تو نبی پاکؐ ان کو علاج کروانے کی تاکید فرماتے:

''(ایک بار کچھ عرب بدو نبی پاکؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! کیا ہم اپنا علاج خود کریں؟، آپؐ نے فرمایا: ہاں، اے اللہ کے بندو! تمہیں لازماً اپنا علاج کرنا چاہیے، کیوں کہ اللہ نے کوئی مرض اس کے علاج کے بغیر نہیں پیدا کیا ہے، سوائے ایک مرض کے، انہوں نے پوچھا: کون سا مرض؟، آپؐ نے فرمایا: بڑھاپا''۔ (۵)

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: ''ہر بیماری کا ایک علاج ہے'' (۶)
جہاں تک متعدی امراض کا معاملہ ہے نبی پاکؐ نے اس سلسلہ میں بھی مسلمانوں کی رہنمائی فرمائی، آپؐ نے فرمایا:

''جب کسی آبادی میں طاعون کی وبا پھیلی ہو تو اس میں مت جاؤ......
البتہ اگر تم پہلے سے وہاں موجود ہو تو وہاں سے باہر نہ بھاگو'' ۔ (۷)

انسان جسم اور روح کا مرکب ہے، نبی پاکؐ نے دونوں کی بیماریوں کی طرف اشارہ کیا اور ساتھ ہی دونوں کے علاج کا طریقہ بھی بتادیا، یہ بیماریاں ایسی ہیں جو جسم اور روح کو الگ الگ بھی اور اکھٹے بھی متاثر کرتی ہیں، آپؐ نے فرمایا کہ: ''تمہارے پاس دو علاج ہیں، شہد اور قرآن'' ۔ (۸)

اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ جسمانی صحت کے ساتھ روحانی صحت کا بھی خیال رکھے، آج کی جدید سائنس اس بات کو مانتی ہے کہ شہد کا استعمال داخلی اور خارجی دونوں طرح کے پھوڑوں کے لیے شفاء بخش ہے، میڈیکل سائنس میں بہت سی ادویات ایسی ہیں جن میں شہد کا استعمال ہوتا ہے، اجوائن کو سب سے بڑی انٹی بائیٹک خیال کیا جاتا ہے، جہاں تک روح کی بیماریوں کا تعلق ہے قرآن کی تلاوت سے جو اثرات پیدا ہوتے ہیں ان میں سب سے اہم اطمینان قلب ہے، اس سے روح خوشی اور فرحت محسوس کرتی ہے، دل کی بیماریوں میں حسد، شک و نفاق کا مرض ہیں یا دل خواہشات نفسانی کا اسیر ہو، اس طرح کی بیماریوں کا علاج قرآن ہے۔

قرآن پاک حرف بحرف کلام الٰہی ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں منع حمل کے حوالے سے کوئی واضح بیان موجود نہیں لیکن قبل اسلام عرب میں بچوں کو قتل کرنے کا رواج عام تھا، موجودہ دور میں یورپ میں تو یہ عمل بہت زیادہ ہے، اب تو اس نے اسلامی ممالک کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، سائنس کی جدید تحقیقات نے اس کے مضر اثرات کے بارے میں سیر حاصل بحث کی ہے، قرآن پاک بھی اس کی مذمت کرتا ہے، ارشاد ربانی ہے کہ:

وَلَاتَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ	اور اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرنا
نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ	کیوں کہ ان کو اور تم کو ہم رزق دیتے ہیں، کچھ
خِطْاً كَبِيْرًا ۔ (القرآن ۱۷: ۳۱)	شک نہیں کہ ان کا مار ڈالنا بڑا سخت گناہ ہے۔

جدید میڈیکل سائنس میں اسقاط حمل کے نقصانات کے بارے میں بہت سی تحقیقات

سامنے آچکی ہیں، اسی طرح دوران حیض عورتوں کے پاس جانے سے منع فرمایا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دوران بیضہ دانی میں Meosis ہورہی ہوتی ہے، جس کی وجہ سے عورتوں کے پاس جانے سے بیضہ دانی میں کینسر کی بیماری ہوسکتی ہے، الغرض اسلام میں جن چیزوں کے استعمال سے منع کیا گیا وہ بھی انسان کے فائدے کے لیے ہے، یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ انسان نے جب بھی فطرت کے خلاف کوئی بھی عمل کیا فطرت کا تو کچھ نہیں بگڑا، البتہ انسان کا اپنا نقصان ضرور ہوا ہے، قرآن پاک تمام علوم کا سرچشمہ ہے، تمام دینی اور دنیاوی علوم اسی سرچشمہ سے اخذ کردہ ہیں، سائنس نے تحقیق کرکے معلوم کیا کہ اس کائنات میں چار قوتیں عمل کرتی ہیں، ان میں سب سے اہم کشش ثقل ہے، یہ زمین کی قوت ہے جو چیزوں کو اپنی طرف کشش کرتی ہے، اگر کسی شئے کو اوپر سے نیچے پھینکا جائے تو اس کی رفتار میں ۳۲ میٹر فی سکینڈ اضافہ ہوتا ہے، اسی طرح اس شئے کی طاقت بڑھ جاتی ہے، اگر ہم کسی ایسی بلندی سے پتھر پھینکیں جو دومنٹ کے بعد زمین پر پہنچے تو اس کی رفتار ۲۴۸۰ فٹ ہوجائے گی یعنی بندوق کی گولی کی رفتار کے مقابلے میں اس کا نصف ہوگی، ابابیل ہمیشہ اونچائی پر پرواز کرتے ہیں، ایک اندازے کے مطابق جس اونچائی پر ابابیل پرواز کرتے ہیں وہاں سے جب کوئی شئے گرائی جاتی ہے تو اس کی رفتار زمین کے قریب پہنچ کر پانچ ہزار فٹ سے تجاوز کرجاتی ہے جو بندوق کی گولی سے دوگنی رفتار ہے جو انسانوں اور حیوانوں کو ہلاک کرنے کے لیے کافی ہے، بندوق کا چھرہ عام قوت سے کسی جاندار پر پھینکا جائے تو اس کے جسم میں زخم نہیں لگتا مگر جب اس کو بندوق کے ذریعے فائر کیا جاتا ہے تو وہی چھرہ اس جاندار کے جسم کو پھاڑتا ہوا گزر جاتا ہے، اس کی وجہ وہ رفتار ہے جو اسے فائر کرتے ہوئے بندوق سے ملتی ہے، قرآن پاک میں اس قوت کا ذکر سورۃ الفیل میں ملتا ہے، ارشاد ربانی ہے کہ:

وَاَرۡسَلَ عَلَیۡهِمۡ طَیۡرًا اَبَابِیۡلَ	اور ان پر جھلڑ کے جھلڑ جانور (ابابیل) بھیجے جو
تَرۡمِیۡهِمۡ بِحِجَارَۃٍ مِّنۡ سِجِّیۡلٍ	ان پر کنکر کی پتھریاں پھینکتے تھے، تو ان کو ایسا کردیا
فَجَعَلَهُمۡ کَعَصۡفٍ مَّاۡکُوۡلٍ ۔	جیسے کھایا ہوا بھُس ۔

(القرآن ۱۰۵: ۳-۵)

جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا گیا کہ قرآن کریم تمام علوم کا سرچشمہ ہے تو ہونا یہ چاہیے کہ

فلسفہ کے درس کا آغاز" وَمَنْ يُّوْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا سے کیا جائے، اسی طرح ہیئت اور فلکیات کا درس يَتَفَكَّرُوْنَ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ ، رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا اور لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابِ سے یا طب وجراحی کی ابتدا شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ و علم الابدال سے کریں اسی طرح جغرافیہ کی ابتدا سِيْرُوْا فِى الْاَرْض اور تاریخ میں لَقَدْ كَانَ فِىْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِى الْاَلْبَابِ کو مدنظر رکھا جائے، یہ تب ہی ممکن ہوگا جب دینی اور دنیوی علوم کو یکجا کیا جائے اور تحقیق کے دروازے کھول دیے جائیں، کیوں کہ علم کا حقیقی سرچشمہ سائنسی اکتشافات نہیں بلکہ وحی و رسالت ہے، کائنات میں کچھ اصول کارفرما ہیں، یہ ایسے قوانین ہیں جن کو خالق کائنات نے اس میں ودیعت کردیا ہے، انسان جب علم و معرفت میں آگے بڑھتا ہے تو وہ اپنے بنیادی وسائل جن میں مشاہدہ اور تجربہ شامل ہیں، ان پر اعتماد کرتا ہے لیکن یہ وسائل جزئی ہیں کلی نہیں، حتمی علم صرف وحی ہے ہماری عقل، رسالت کی مدد سے درجہ کمال تک پہنچتی ہے، آئے دن انسان کو خارجی معلومات میں مظاہر کا سراغ ملتا رہتا ہے جو اس کائنات میں پائی جانے والی وحدت کی طرف اشارہ کرتے ہیں، سائنس داں اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ اس کائنات میں وحدت پائی جاتی، انسان نے اپنے امکانی علم سے یہ پتہ لگالیا ہے کہ اس کائنات کی پوری عمارت کی بنیادی اینٹ "ایٹم" ہے اور یہ کہ ایٹم اپنے اندر بے پناہ توانائی رکھتا ہے، ایٹم کے اندر یہ توانائی کس طرح پیدا ہوتی ہے، ایٹم کا پورا نظام بڑا پیچیدہ ہے، اس میں ایک مرکز ہوتا ہے جس کے گرد الیکٹران گردش کرتے ہیں، یہ گردش ایک سائنس داں کے نزدیک الیکٹران اور پروٹان کی کشش کی وجہ سے ہوتی ہے، کیوں کہ الیکٹران پر منفی چارج ہوتا ہے جب کہ پروٹان پر مثبت چارج ہوتا ہے لیکن کوئی سائنس داں یہ نہیں بتا سکا کہ یہ چارج کیسے پیدا ہوتا ہے، اس کے پیچھے کون سی قوت ہے، یہ قوت خود اللہ رب العزت کی ذات ہے جس نے ایٹم سے لے کر سورج، چاند اور ستاروں میں حرکت پیدا کی۔

اللہ رب العزت نے انسان میں روح پھونکی تو وہ اس بات سے بھی آگاہ ہے کہ اس کے جسم میں پائے جانے والے ایک ایک خلیہ میں کیا کیا صلاحیتیں پوشیدہ ہیں، انسانی جسم کے خلیے کا نظام بھی بڑا پیچیدہ ہے، اس میں موجود ڈی۔این۔اے (DNA) دراصل انسانی جسم کا ڈیٹا بیس

ہے،اس میں انسان کی تمام خصوصیات کا ریکارڈ موجود ہوتا ہے،انسانی خلیہ میں اللہ تعالیٰ نے ڈی۔
این۔اے کو وسط میں محفوظ کیا ہے، عام طور پر ایک خلیہ کا ڈایا میٹر یعنی نصف قطر ایک ملی میٹر کا
سوواں حصہ ہوتا ہے، اس کو آسان زبان میں یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ اڑھائی کلوگرام سفید چینی
لے کر اس کے دانے گن لیے جائیں، اب ان میں سے ایک دانہ لے کر اس کے اتنے حصے کر دیے
جائیں جتنے کہ اڑھائی کلوگرام چینی میں دانے ہیں، اس کا جو آخری حصہ بچے گا وہ خلیہ کی جسامت
ہے، ڈی۔این۔اے میں موجود معلومات نہ صرف جسمانی خصوصیات کے حامل ہیں بلکہ انسانی
جسم میں موجود تمام افعال کو بھی کنٹرول کرتے ہیں، مثلاً بلڈ پریشر کو کنٹرول کرنا وغیرہ۔

انسان کے خلیہ میں موجود جین (Gene) میں موجود معلومات کے بارے میں لکھی گئی
کتابوں کو جمع کر کے ایک کے اوپر ایک رکھا جائے تو یہ ستر میٹر کی چوڑائی کے ساتھ نا قابل یقین
اونچائی تک پہنچ جائیں گی، سائنس دانوں نے یہ بھی اشارہ کیا ہے کہ اگر ان معلومات کو ٹائپ کیا
جائے تو اس کام کے لیے آدھی صدی چاہیے، یعنی یہ معلومات اتنی زیادہ ہیں کہ پانچ سو صفحات پر
مشتمل دو سو ٹیلی فون ڈائریکٹریز ڈی۔این۔اے میں موجود معلومات سے بھر جائیں گی۔

ایٹم ایک زنجیر کی مانند ساتھ ساتھ قطار میں موجود ہوتے ہیں، ان کا قطر ایک ملی میٹر کا
دس لاکھواں حصہ ہوتا ہے، ان کے اندر اتنی معلومات موجود ہوتی ہیں کہ ایک زندہ مخلوق انہیں اپنی
پوری زندگی کے افعال سرانجام دینے کی غرض سے استعمال کر سکتی ہے، یہ شہادت ہے تخلیق کی،
اللہ تعالیٰ کا علم لامحدود ہے جس تک انسان کی رسائی ناممکن ہے، ارشاد ربانی ہے کہ:

قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّیْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ۔ (القرآن ۱۸: ۱۰۹)

کہہ دو کہ اگر سمندر میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کے لیے سیاہی ہو تو قبل اس کے کہ میرے پروردگار کی باتیں تمام ہوں سمندر ختم ہو جائے، اگرچہ ہم ویسا ہی اور اس کی مدد کو لائیں۔

قرآن پاک اور سائنس کے نظریات وقوانین میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے، منطقی علم
کے مطابق اگر دو چیزیں ایک ہی بات بیان کر رہی ہوں تو بعد میں آنے والی چیز پہلے سے موجود
چیز کی ترجمانی کرتی ہے، چوں کہ قرآن پاک کا نزول پہلے ہوا اور سائنسی تعلیم کا ظہور بعد میں ہوا،

لہذا اس اصول کی رو سے سائنس قرآن پاک کی ترجمانی کرتی ہے، مثلاً ارشاد ربانی ہے کہ:

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَنَّ السَّمٰوٰتِ	کیا کافروں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین
وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا	دونوں ملے ہوئے تھے تو ہم نے جدا جدا کر دیا
وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ	اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائیں،
اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ۔ (القرآن ۲۱: ۳۰)	پھر یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔

قرآن پاک کے اس انکشاف کو سائنس یوں بیان کرتی ہے کہ اربوں سال پہلے بگ بینگ نامی (Big Bang) دھماکہ ہوا جس کے نتیجے میں آگ کا ایک بگولہ پیدا ہوا پھر اس بگولے نے ٹھنڈے ہوکر زمین بنائی جب کہ اس بگولے میں موجود گیسوں اور بھاپ نے ٹھنڈے ہوکر آسمان (خلاء) بنایا یعنی بگولے میں زمین و آسمان دونوں ملے ہوئے تھے مگر بعد میں الگ ہو گئے، اسی طرح ارشاد ربانی ہے کہ:

وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ	اور ہم نے زمین میں پہاڑ بنائے تا کہ لوگوں کے
تَمِيْدَ بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا	بوجھ سے ہلنے اور جھکنے نہ لگے اور اس میں کشادہ
سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۔	راستے بنائے تا کہ لوگ ان پر چلیں۔
(القرآن ۲۱: ۳۱)	

سائنس اس بات کو یوں بیان کرتی ہے کہ زمین اپنے محور پر جھکی ہوئی ہے اور اس کا یہ جھکاؤ زمین کی مخصوص ساخت یعنی پہاڑوں کی وجہ سے ہے، اسی طرح ارشاد ربانی ہے کہ:

وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا	اور آسمان کو محفوظ چھت بنایا اس پر بھی وہ اس کی
وَهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ۔	نشانیوں سے منہ پھیر رہے ہیں۔
(القرآن ۲۱: ۳۲)	

سائنس بیان کرتی ہے کہ زمین کے گرد آسمان (خلا) میں اوزون گیس کی ایک تہہ ہے جو سورج سے آنے والی بنفشی شعاعوں کو روکتی ہے اور ان کو زمین تک پہنچنے نہیں دیتی، کیوں کہ یہ شعاعیں انسانی زندگی کے لیے خطرناک ہیں، اس طرح آسمان، انسان اور زمین کی حفاظت کرتا ہے یعنی ایک محفوظ چھت فراہم کرتا ہے، بیسویں صدی کے سائنس دانوں نے تحقیق کے بعد یہ ثابت

کیا کہ ہماری زمین کے گرد ایک کرہ ہوائی ہے جس کو انہوں نے اوزون تہہ کا نام دیا، یہ کرہ ہوائی زمین کے گرد اس طرح لپٹا ہوا ہے کہ شہابوں (Meteros) کو زمین تک پہنچنے سے پہلے ہی جلا کر خاک کر دیتا ہے، اس طرح سورج سے نکلنے والی مضر صحت شعاعوں کو زمین تک پہنچنے سے روکتا ہے، ان میں سے صرف وہی شعاعیں زمین تک پہنچتی ہیں جو زندگی کے ارتقاء اور تسلسل کے لیے ضروری ہیں، ان شعاعوں میں مرئی روشنی (Visible Light) نزد بالائے بنفشی (Near Ultravoilet) اور ریڈیو لہریں شامل ہیں، نزد بالائے بنفشی شعاعیں جو جزوی طور پر اوزون تہہ سے گزر سکتی ہیں، وہ پودوں کے لیے اہم کردار ادا کرتی ہیں، اگرچہ سورج سے ان شعاعوں کی ایک خاصی مقدار خارج ہوتی ہے مگر زمین تک وہی لہریں پہنچتی ہیں جو زندگی کی بقا کے لیے ضروری ہیں، یہ اوزون کہ تہہ صرف ان لہروں کو فلٹر ہی نہیں کرتی بلکہ زمین کو منجمد ہونے سے بھی بچاتی ہیں، بیرونی خلاء کا درجہ تقریباً ۲۷۰ ڈگری سنٹی گریڈ ہوتا ہے، اگر یہ اوزون تہہ نہ ہوتی تو زمین کی حرارت بڑی تیزی سے خلاء میں منتقل ہوتی رہتی اور آج ہماری زمین کا درجہ حرارت اس قدر کم ہو جاتا کہ یہاں زندگی ممکن نہ ہوتی، اس حوالے سے بھی اس تہہ کا کردار بڑا اہم ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور تہہ بھی زمین کے گرد لپٹی ہوئی ہے جس کو وان ایلن بیلٹ (Van Allen Belt) کہا جاتا ہے، یہ ایک ایسی تہہ ہے جو زمین کی مقناطیسی خصوصیات کی بنا پر زمین کے گرد قائم ہے، یہ بھی مضر شعاعوں کے خلاف ڈھال کا کام دیتی ہے، سورج اور دوسرے سیاروں سے باردار ذرات (Charged particles) مسلسل پیدا ہوتے رہتے ہیں، سائنس کی زبان میں اس عمل کو شمسی ہوا (Solar wind) کا نام دیا جاتا ہے، اس عمل کے دوران سیاروں سے لاکھوں کلومیٹر بلند شعلے بھی نکلتے ہیں، ان شعلوں میں بہت زیادہ توانائی ہوتی ہے، اگر زمین کے گرد یہ تہہ نہ ہوتی تو زمین ایک لمحہ میں جل کر راکھ ہو جاتی، سائنس دانوں نے اس توانائی کا تخمینہ اس طرح لگایا کہ ہیروشیما پر گرائے جانے والے ایٹم بم کے مقابلے میں ۱۰۰ کھرب گنا زیادہ ہوتی ہے، اس طرح ارشاد ربانی ہے کہ:

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجۡعِ ۔ (القرآن ۸۶:۱۱) آسمان کی قسم جو مینہ برساتا ہے۔

فیروز اللغات میں الرجع کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ رجع (ض) رجوعاً و مرجعاً

و رجعیٰ و رجعاناً الی، کسی کی طرف لوٹنا، فی: (الفاظ) واپس لینا، فیہ: (نصیحت یا غذا کا) کسی کو فائدہ دینا، عن: (کسی جگہ سے) لوٹ آنا، اس طرح الـرجع کے معنی یہ بھی کیے جا سکتے ہیں ''واپس بھیجنا'' پلٹانا، چنانچہ زمین کے گرد کرہ ہوائی خلاء سے آنے والی شعاعوں اور زمین سے اٹھنے والی شعاعوں یا مادوں کو واپس لوٹا دیتا ہے، زمین کی سطح سے ۱۵۱۳ کلو میٹر بلند ٹروپواسفیئر (Troposphere) ہے جو سطح زمین سے اٹھنے والی آبی بخارات کی تکثیف کرتا ہے اور ان کا واپس زمین پر برسنے کا انتظام کرتا ہے، اوزون تہہ کی بلندی ۲۵ کلو میٹر ہے جو خلاء سے آنے والی مضر صحت شعاعوں کو واپس خلاء میں پلٹانے کا کام کرتی ہے، اسی طرح آئنواسفیئر (Ionosphere) زمین سے نشر ہونے والی ریڈیو لہروں کو واپس سطح زمین کی جانب منعکس کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ریڈیو، ٹی-وی اور دوسری مواصلاتی نشریات لمبے فاصلوں سے بھیجی اور وصول کی جاسکتی ہیں، اسی طرح مقناطیسی کرہ (Magnetosphere) کی تہہ سورج سے نکلنے والے باردار ذرات کو زمین پر پہنچنے سے روکتا ہے، یہ سب کچھ صدیوں پہلے کلام ربانی میں بیان ہو چکا ہے۔

موجودہ دور میں انسان ایسے سیاروں اور ستاروں پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے جو زمین سے کئی نوری سال کے فاصلے پر واقع ہیں، ان تک پہنچنے کے لیے سینکڑوں سال درکار ہیں، اگرچہ ٹیکنالوجی کے ذریعے انسان نے یہ صلاحیت حاصل کر لی مگر انسان کی عمر کا دورانیہ اس مشن میں بڑی رکاوٹ ہے، قرآن پاک اس مسئلے میں بھی انسان کی راہ نمائی کرتا ہے، قرآن پاک میں اصحاب کہف کا واقعہ بیان ہوا ہے کہ سات نوجوان تھے جن کو اللہ نے ظالم بادشاہ سے بچانے کے لیے ایک غار میں ۳۰۰ شمسی سال تک نیند یا بے ہوشی کی حالت میں رکھا، اس واقعہ سے سائنس کو یہ پیغام مل رہا ہے کہ ایک لمبے عرصہ تک انسان کو بے ہوش کر کے دوبارہ ہوش میں لایا جاسکتا ہے، اگر سائنس داں یہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنے مشن میں کامیاب ہوں تو ان کو چاہیے کہ اصحاب کہف والی صلاحیت حاصل کرنے کی کوشش کریں، اس کے لیے ضروری ہے کہ سائنس قرآن پاک کی ان دو آیات کو مدنظر رکھ کر تحقیق کریں، ان آیات میں ہوا کو قابو میں لانے کا واضح اشارہ ملتا ہے، ارشاد ربانی ہے کہ:

وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ وَّ اَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ ۔(القرآن ۳۴: ۱۲)

اور ہوا کو ہم نے سلیمان کا تابع کر دیا تھا، اس کی صبح کی منزل ایک مہینے کی راہ ہوتی اور شام کی منزل بھی مہینے بھر کی ہوتی۔

سُبْحَانَ الَّذِىْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِىْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۔ (القرآن ۱:۱۷)

وہ ذات پاک ہے جو ایک رات اپنے بندے کو مسجد الحرام یعنی خانہ کعبہ سے مسجد اقصیٰ یعنی بیت المقدس تک جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں، لے گیا تاکہ ہم اسے اپنی قدرت کی نشانیاں دکھائیں، بے شک وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کائنات کو انسان کے لیے مسخر کر دیا ہے، اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ کس طرح تحقیق کے ذریعے اس کو مسخر کرتا ہے، یقیناً یہ کام مطالعہ فطرت سے ہی ممکن ہے، ارشاد ربانی ہے کہ:

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ۔ (القرآن ۳۱: ۲۰)

کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں تمہارے لیے مسخر کر رکھی ہیں اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کر دی ہیں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے مسخر کی تفسیر یوں کی ہے کہ کسی چیز کو کسی کے لیے مسخر کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ وہ چیز اس کے تابع کر دی جائے اور اسے اختیار دے دیا جائے کہ جس طرح چاہے اس میں تصرف کرے اور جس طرح چاہے اسے استعمال کرے، دوسری یہ کہ اس چیز کو ایسے ضابطہ کا پابند کر دیا جائے جس کی بہ دولت وہ اس شخص کے لیے نافع ہو جائے اور اس کے مفاد کی خدمت کرتی رہے، زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے ایک ہی معنی میں مسخر نہیں کر دیا ہے بلکہ بعض چیزیں پہلے معنی میں مسخر کی ہیں اور بعض دوسرے معنی میں، مثلاً ہوا، پانی، مٹی، آگ، نباتات، معدنیات، مویشی وغیرہ بے شمار چیزیں پہلے معنی میں ہمارے لیے مسخر ہیں اور چاند، سورج وغیرہ دوسرے معنی میں۔(۹)

انسانی طاقت اور تسخیر کا راز بظاہر نظر نہیں آتا، اگر انسان کا سائنسی تجزیہ کیا جائے تو اس کا جسم عناصر اربعہ، آگ، پانی، مٹی اور ہوا کا مجموعہ ہے، اس میں کوئی لطافت نظر نہیں آتی، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس میں لطافتوں کو زیر کر دینے کی لطافت آخر کہاں مخفی ہے؟ اگر یہ طاقت بدن میں ہوتو یہ تھوڑی سی آگ اور پانی سارے جہاں کے آگ اور پانی پر غلبہ کے لیے کافی نہیں، اسی طرح کا معاملہ مٹی اور ہوا کے ساتھ بھی ہے جو کائنات میں موجود ہوا اور مٹی کی نسبت بہت ہی قلیل ہے، لہذا یہ کرشمے کسی اور شے میں ہو سکتے ہیں، وہ روح ہے، روح صرف عناصر اربعہ ہی نہیں بلکہ تمام لطافتوں سے زیادہ لطیف ہے، عناصر اربعہ کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ نسبت جزوی ہے جب کہ روح کی نسبت بہ حیثیت مجموعی ہے، یہی وجہ ہے کہ مادی طاقتوں پر روحانی طاقت فوقیت لے جاتی ہے، اس کی واضح مثال معراج کا واقعہ ہے۔

دنیا کے تمام مذاہب میں دین اسلام ہی وہ پہلا اور آخری مذہب ہے اور آسمانی صحائف میں قرآن پاک وہ واحد صحیفہ ہے جس نے انسان کو کائنات اور نظام کائنات پر غور و فکر کی دعوت دی ہے اور اپنی تعلیمات کے ثبوت کے لیے کائنات اور اس کے نظام کو بطور ثبوت پیش کیا، کائنات کے ذرے ذرے میں اہل فکر و نظر کے لیے خالق کائنات کے وجود، اس کی وحدانیت کے دلائل موجود ہیں، قرآن پاک کی کل آیات کی تعداد ۶۶۶۶ ہے، ان میں سے ۷۵۶ آیات ہیں جو مظاہر فطرت پر غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں، قرآن پاک انظروا، ینظرون، تنظرون اور الناظرین کے الفاظ استعمال کرتا ہے، یہ لفظ قرآن پاک میں ۱۳۰ مرتبہ آیا ہے اور ۱۶ سے ۲۰ مرتبہ انفس و آفاق کے سیاق وسباق میں آیا ہے، اسی طرح ۲۳ مرتبہ تعقلون اور ۲۰ مرتبہ سے زائد یعقلون کے الفاظ وارد ہوئے (۱۰)، قرآن پاک میں جن آیات میں غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے وہ قرآن پاک کا تقریباً آٹھواں حصہ بنتی ہیں، ان مظاہر کا تعلق زمین، آسمان، جانوروں، چرندوں، پرندوں، موسم اور خود انسان، غرض روز مرہ مشاہدے میں آنے والی اشیاء سے ہے، سائنس کا موضوع بحث بھی یہی اشیاء ہیں، یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن پاک کا ایک ایک لفظ صحیح ہے اور اس کلام کی سچائی ہمارے ایمان کا لازمی جزو ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کیوں ہمیں بار بار مظاہر فطرت کی طرف متوجہ کرتا ہے یعنی قرآن پاک غور و فکر کی دعوت دیتا ہے؟ ''اللہ کی نشانیاں ہیں''

اور ''عقل والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں''۔

اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے، وہ انسان کے ظاہر اور باطن سے واقف ہے، اللہ تعالیٰ کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا کہ وہ انسان کو اس بات کا پابند کر دیتا کہ وہ نظام کائنات پر غور کرنے کے بجائے اس کو اللہ تعالیٰ کی تخلیق مان کر قبول کر لے مگر ایسا نہیں ہوا بلکہ یہاں تک فرما دیا کہ:

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ	اور جب ان کو پروردگار کی باتیں سمجھائی جاتی ہیں
يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا ۔	تو ان پر اندھے اور بہرے ہو کر نہیں گرتے بلکہ
(القرآن ۲۵: ۷۳)	غور وفکر سے سنتے ہیں۔

جب کوئی مسلمان سائنسی تحقیق کو اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھ کر اس کی جانب متوجہ ہوگا تو اس کا یہ عمل اللہ کی نشانیوں پر غور وفکر کرنے کا ہوگا، تحقیق جاری رکھ کر وہ نت نئی دریافتیں کر سکتا ہے اور ان کے ذریعے بنی نوع انسان کی بہتر خدمت انجام دے سکتا ہے، اسلام میں حقوق العباد کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے، انسان فطری طور پر مدنی الطبع ہے، اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں ایمان ویقین کی جو کیفیت پیدا ہوگی وہ زیادہ مضبوط ہوگی، ارشاد ربانی ہے کہ:

وَمَا يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۔	اور اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہے۔
(القرآن ۳۵: ۱۹)	

اس آیت میں اندھے سے مراد بے علم اور آنکھوں والے سے مراد علم والے ہیں یعنی جو تحقیق کرتے ہیں، تحقیق، دریافت، ایجاد، اطلاق اور نفع کے اس تمام عمل میں مسلمان اس نیت سے کام کرے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا حکم پورا کر رہا ہے تو اس سے اسلام کا بول بالا ہوگا اور مسلمانوں کو اغیار کے سامنے معذرت خواہانہ رویہ اختیار نہیں کرنا پڑے گا، اللہ تعالیٰ کو ماننے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں لیکن جب ہم مظاہر فطرت پر غور وفکر کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی قدرت وکبریائی کے قائل ہوتے جاتے ہیں، قرآن پاک میں کائنات کے اختتام اور نئی ابتدا کے بارے میں بھی ذکر ملتا ہے، ارشاد ربانی ہے کہ:

يَوْمَ نَطْوِى السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ	وہ دن جب کہ آسمان کو ہم یوں لپیٹ کر رکھ دیں
لِلْكُتُبِ كَمَا بَدَاْنَا اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ	گے جیسے طومار میں اوراق لپیٹ دیے جاتے ہیں

وَعْدًا عَلَيْنَا اِنَّا كُنَّا فَاعِلِيْنَ ۔ جیسے کہ ہم نے اول دفعہ پیدائش کی تھی ، اسی طرح
(القرآن ۲۱: ۱۰۴) دوبارہ کریں گے ، یہ ہمارے ذمے وعدہ ہے اور ہم
اسے ضرور کرکے (ہی) رہیں گے ۔

پہلے تو اس آیت کے ترجمہ میں لفظ ''طومار'' کی وضاحت ضروری ہے ، پرانے زمانے میں جب کاغذ ایجاد نہیں ہوا تھا ، اس وقت درخت کی نرم چھال یا کسی جانور کے چمڑے پر لکھا جاتا تھا ، ایسے مکتوبات یا خطوط کو محفوظ کرنے کے لیے انہیں لپیٹ کر (رول کرکے) رکھا جاتا تھا تاکہ ضرورت کے وقت ان کو کھول کر پڑھا جاسکے ، طومار کا لفظ بھی ان ہی معنی میں استعمال ہوا ہے ، درج بالا آیت میں کائنات کو ایک ایسے طومار سے تشبیہ دی گئی ہے جو ابھی تک ''کھلا ہوا'' ہے لیکن ایک دن اللہ تعالیٰ اس کو لپیٹ لے گا ، آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت نے کائنات کے بارے میں ہمارے تصورات کو بدل کر رکھ دیا ، اس نظریہ کی بدولت پہلی بار کونیات کو سائنس کا درجہ ملا ، نظریہ اضافیت کے بعد وقت یعنی زماں (Time) کو خلاء یعنی مکاں (Space) ہی کی طرح کائنات کی ایک جہت (Dimension) قرار دیا گیا جو کائنات کی ابتدا سے لے کر ارتقاء تک میں سرگرم کردار ادا کرتی ہے ، یہی وجہ ہے کہ آج کائنات میں کسی مقام کی نشان دہی کرنے کے لیے اس کے ''زماں و مکاں'' کا استعمال کیا جاتا ہے ، ماہرین کونیات کا بھی کہنا ہے کہ کائنات کھلی ہوئی حالت میں ہے لیکن ان کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ کائنات کی یہ حالت کب تک برقرار رہے گی ، البتہ اس کائنات کے اختتام کے بارے میں وہ دو ممکنہ صورتیں تجویز کرتے ہیں ، ایک یہ کہ کائنات پھیلتی جارہی ہے اور ساتھ ہی اس کے درجہ حرارت میں بھی کمی واقع ہو رہی ہے ، اس طرح ایک دن اس کائنات کا درجہ حرارت صفر ہو جائے گا ، کائنات کی اس کیفیت کو حرارتی موت کہا جاتا ہے ، دوسری صورت یہ ہے کہ کائنات کا پھیلاؤ آہستہ آہستہ کم ہوتا جائے گا ، یہاں تک کہ ایک دن رک جائے گا یعنی وجود سے عدم میں چلی جائے گی ، قرآن پاک اپنے انداز بیان میں عام انسان سے لے کر ماہرین کونیات سب کو مخاطب کرتا ہے کہ کائنات کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح پہلے تخلیق کیا دوبارہ اسی طرح تخلیق کرے گا ، قرآن پاک کے معجزہ ہونے کی یہ ایک اور سائنسی دلیل ہے لیکن افسوس کہ جو باتیں صدیوں پہلے قرآن پاک نے بتائیں وہ ہماری نظروں

سے اوجھل رہیں اور ان کو ان لوگوں نے دریافت کیا جو ملحد ہیں، ذہن اور دل کو جب بھی کھولا جائے تو کھویا ہوا مقام بحال ہوسکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو حواس خمسہ سے اسی لیے نوازا ہے کہ وہ دیکھے اور پھر غور وفکر کرے، ارشاد ربانی ہے کہ:

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۔(القرآن ۷۸:۲۳)	اور وہی تو ہے جس نے تمہارے کان اور آنکھیں اور دل بنائے لیکن تم کم شکر گزاری کرتے ہو۔

اکیسویں صدی میں انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ماحولیاتی آلودگی کا ہے، اس میں شور کی آلودگی (Noise Pollution) سب سے زیادہ خطرناک ہے، کیوں کہ اس کے سبب کم سننے اور بہرے پن کے خطرات بڑھتے جارہے ہیں، اس کے علاوہ شور انسانی دماغ کے خلیوں کو مردہ کردیتا ہے، یہ ٹینشن کا سبب بنتا ہے، جدید تحقیقات نے یہ ثابت کیا ہے کہ ٹینشن تمام امراض کی جڑ ہے، قرآن اور حدیث میں اس کی مذمت کی گئی ہے، انسان کو یہ ہدایت کی ہے کہ اپنی ہر بات میں اعتدال کا رویہ اختیار کرے، اسلام خود اعتدال کا ہی نام ہے، ارشاد ربانی ہے کہ:

وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ۔ (القرآن ۱۹:۳۱)	اور اپنی چال میں اعتدال کیے رہنا اور بولتے وقت آواز نیچی رکھنا اونچی آواز گدھوں کی سی ہے اور کچھ شک نہیں کہ سب سے بری آواز گدھوں کی ہے۔

اسی طرح اکیسویں صدی کا ایک اور بڑا مسئلہ کلوننگ (Cloning) کا ہے جس پر مذہبی حلقوں نے بہت زیادہ تنقید کی لیکن سورۂ قیامہ میں حشر کا جو بیان ہے اس سے کلوننگ کو تقویت ملتی ہے، روس کے سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ:

Russian scientists recently discussed reproducing an extinct species of elephant by use of a microscopic unit of long-dead gene material. No one in the scientific community said that was unreasonable. The point is that the resurrection of the dead might be an unusual think but it certainly is not

unreasonable. The use of cloning techniques throws further light on the amazing nature of the Quranic verses which compares the resurrection of the dead with human development from an insignificant zygote to the fetus. Cloning provides theoretic and empirical evidence for the resurrection of the dead. (۱۱)

سائنس ایک ایسا چہرہ ہے جس کو قرآن پاک کی ہدایات کے مطابق نکھار لیا جائے تو یہی سائنس فیضان الٰہی کا بہتا دریا ہو جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم خالص سائنسی نظریہ کائنات کے بجائے قرآنی نظریہ کائنات سے ابتدا کریں، قرآن پاک نے انسان کو تحقیق کرنے کے لیے چیلنج کیا ہے، ارشاد ربانی ہے کہ:

یَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطَانٍ ۔ (القرآن ۵۵: ۳۳)	اے گروہ جن وانس اگر تمہیں قدرت ہو کہ آسمان اور زمین کے کناروں سے نکل جاؤ تو نکل جاؤ اور زور کے سوا تو تم نکل سکتے ہی نہیں۔

اس آیت میں صرف انسانوں کو ہی نہیں بلکہ جنات کو بھی مخاطب کیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ تفکر و تدبر کرنے والی ہر ذی شعور مخلوق کے لیے فکر کا سامان ہے، یہ فکر ایک چیلنج کی شکل میں ہے، یہاں زمین کے کناروں سے نکلنے کا مطلب یہ ہے کہ فضا میں بلند ہونا، اسی طرح آسمان کے کناروں سے نکلنے کا مطلب یہ ہے کہ کشش ثقل کی حدود سے نکلنا ہے، آج ہم آئے دن خلائی پروازوں، خلائی اسٹیشن، خلائی تجربات اور خلائی تسخیر وغیرہ کے بارے میں اخبار، ریڈیو اور ٹی-وی وغیرہ پر خبریں پڑھتے اور سنتے ہیں، ان تمام انسانی کاوشوں کا حصول اس لیے ممکن ہوا کہ انسان نے وہ رفتار حاصل کر لی ہے جو زمین کی کشش ثقل سے باہر نکلنے کے لیے ضروری ہے، اس نے ایسے راکٹ بنائے جو لاکھوں پونڈ فی سکنڈ کی شرح سے گرم گیسوں کا اخراج کر کے وہ ''زور'' حاصل کرتے ہیں جو زمین کی کشش ثقل سے فرار ہونے کے لیے ضروری ہے لیکن افسوس کہ یہ کام

بھی ہمارے ہاتھوں نہیں ہوا، یہ ''زور'' حصول علم، تحقیق وجستجو اور جذبہ دریافت وایجاد کے بغیر ممکن نہیں، اللہ ہر شئے کا علم رکھتا ہے، اس نے اپنی طاقت کا اظہار قرآن پاک میں یوں کیا ہے:

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ فَاعْبُدُوْهُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌ ۔ (القرآن ٦: ١٠٣)

(لوگو) یہی اللہ تمہارا پروردگار ہے، اس کے سوا کوئی (اور) معبود نہیں (وہی) تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا ہے تو اسی کی عبادت کرو اور وہی ہر چیز کا نگہبان ہے۔

حوالہ جات

(۱) صحیح مسلم، کتاب القدر، ص ۱۲۱، ۵۲۰۔ (۲) ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، تشبیہات رومی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۶۰۔ (۳) صحیح مسلم، کتاب البر، حدیث نمبر ۶۲، ج ۴۔ (۴) مسند امام احمد حنبل، ج ۶، ص ۱۵۶۔ (۵) سنن ابی داؤد، کتاب الطب، ج ۴، ص ۳۔ (۶) صحیح بخاری کتاب الطب، ج ۳، جزء ۷، ص ۱۵۸۔ (۷) امام احمد بن حنبل، ج ۱، ص ۱۹۲۔ (۸) سنن ابن ماجہ، کتاب الطب، جز ۴، ص ۱۱۴۲۔ (۹) سید ابوالاعلی مودودی، ترجمہ قرآن مجید مع مختصر حواشی، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۸۰ء، ص ۱۰۴۳، حاشیہ نمبر ۵۔ (۱۰) ڈاکٹر حافظ حقانی قادری، قرآن، سائنس اور تہذیب، کراچی ایڈیشن، ۱۹۹۹ء، ص ۲۳- ۲۴۔

(۱۱) Asad, Muhammed, Miller, Gary. The Amazing Quran. (Video Recording, transcribed, Sept 1990, Lahore, Pakistan۔

آزاد ہندوستان کے پہلے اقبال شناس
مولانا عبدالسلام ندوی

پروفیسر عبدالحق

علامہ اقبال خوش نصیب تھے کہ ان کی اجازت کے بغیر ان کے بہی خواہوں نے ان کے کلام کی جمع و ترتیب اور اشاعت شروع کی، تقریباً ہر شہر اور علاقے کے ادب دوستوں نے بیاض تیار کیے اور کلام اقبال کو محفوظ کیا، ان کی زندگی میں ہی ان کے شعر و فن اور زبان و بیان پر انتقادی بحث شروع ہوگئی تھی، ۱۹۰۴ء میں لکھنؤ کے اہل زبان نے اعتراضات کیے اور اقبال نے بھرپور جواب بھی لکھے جب کہ اقبال کی شاعری کے کچھ برس بھی نہ گزرے تھے مگر ان کی نظموں نے خاص و عام کو متوجہ کیا تھا، ان کی مثنویوں کے انگریزی تراجم شائع ہوئے اور ۱۹۲۳ء میں احمد دین نے اقبال کی حیات اور شعری محاسن پر پوری کتاب شائع کی، یہ سلسلہ جاری تھا، ان کی وفات کے بعد ان پر خاص توجہ دی گئی، اقبال شناسی ایک مستقل موضوع کی صورت اختیار کرنے لگی، وفات کے بعد ایک بہت ہی وقیع کتاب لکھی گئی، آج تک کوئی دوسری تصنیف اس کی حریف نہ بن سکی، ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی ''روح اقبال'' ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی، جس کے اب تک تیرہ ایڈیشن سامنے آچکے ہیں، انتقادی ادب میں یہ کسی عجوبے سے کم نہیں ہے، مصنف اردو یا فارسی ادب کی تدریس سے وابستہ نہ تھے بلکہ تاریخ کے استاد تھے، مگر ان کا یہ گراں مایہ کام اقبال شناسی میں فلک تاب گنج گہر سے کم نہیں ہے، ۱۹۳۸ء کے بعد اقبال کی سیاسی فکر اعتراضات کی ہدف بنی اور آزادی ملنے کے بعد تو انہیں دانستہ طور پر نظر انداز کیا جانے لگا، اردو والوں پر ایک سکتہ طاری تھا، بڑے جلیل القدر اساتذہ اور انتقاد کے علم بردار بھی اقبال سے گریزاں نظر آنے

وزیٹنگ پروفیسر، دہلی یونی ورسٹی۔

لگے، پڑھنا پڑھانا تو در کجا نام لینا بھی گوارا نہ تھا۔

ایسی سراسیمہ فضا میں ایک عالم دین کا اقبال سے التفات کرنا بڑی جرأت مندی کا اقدام تھا، علما ویسے بھی ادب سے زیادہ سروکار نہیں رکھتے اور نزاعی مسائل سے دامن کشاں رہنے میں عافیت محسوس کرتے ہیں، اقبال سے فاصلہ رکھنے کا ایک دوسرا جواز بھی تھا، مولانا حسین احمد مدنی کے بارے میں اختلافی نظم لکھنے کے سبب بھی ایک دبستان فکر کے علما اقبال سے خوش نہ تھے، میرا خیال ہے کہ اگر مولانا عبدالسلام ندوی کی جگہ قاسمی ہوتے تو شاید کبھی بھی اس حوصلہ مندی کا ثبوت نہ دے پاتے، مولانا آزاد کی طرح دیوبند کے علما نے بھی اقبال کو قابل اعتنا نہیں سمجھا، وہ لوگ اقبال کا ایک طرح سے اقبال سے گریزاں نظر آتے ہیں، انتہا یہ ہے کہ مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم نے اسیر مالٹا مولانا محمود الحسن کے ترجمہ قرآن پر جو حواشی لکھے ہیں اس میں اردو فارسی کے بیسیوں اشعار نقل کیے ہیں لیکن اقبال کا ایک مصرع بھی نظر نہیں آتا، حد ہے کہ اپنے دادا کے کئی اشعار نقل کیے ہیں، اکبر و غالب بھی ہیں مگر نہیں ہیں تو اقبال جب کہ موصوف قائد اعظم مرحوم کے فکر و عمل سے خاص قربت رکھتے تھے، یہی حال کاندھلہ خانوادے کے مشہور عالم کا ہے جنہوں نے شمائل ترمذی شریف کے اردو ترجمے کے مقدمہ میں بہت سے اشعار قلم بند کیے ہیں بدونِ شعر اقبال، جو بھی ہو نا چیز عبدالسلام ندوی کی انتقادی حدت و حرارت کو آفریں کہتا ہے جس نے ۱۹۴۷ء کے بعد انتہائی ناخوش گوار حالات میں اقبال پر پہلی کتاب لکھنے کے لیے اپنے کو آمادۂ تحریر کیا۔

منم آں قطرۂ شبنم کہ نوک خار می رقصم

بغیر کسی پس و پیش کے یہ کہنے میں عار نہیں ہے کہ آزادی کے بعد مولانا کی ہی ادبی بصیرت تھی جو ۱۹۴۸ء میں ''اقبال کامل'' جیسی اہم تصنیف کا باعث بنی، اس سے قبل دسمبر ۱۹۴۷ء میں وی۔جی۔ کیرنن کی کتاب (Poems from Iqbal) شائع ہو چکی تھی مگر یہ تالیف نہیں ہے بلکہ اقبال کی چند منتخب نظموں کا انگریزی ترجمہ ہے، جسے تصنیف نہیں کہہ سکتے، بہ الفاظ دیگر آزاد بھارت میں مولانا محترم ہی اقبال شناسی کے اولین روح رواں ہیں، ان کی تصنیف و تحریک کے طفیل اقبال پر ذی فکر اکابر علم متوجہ ہوئے، بہ قول فیض:

میں نے جو طرز فغاں کی ہے قفس میں ایجاد فیض گلشن میں وہی طرز بیاں ٹھہری ہے

ان کے بعد خورد و بزرگ کا رجحان یا رویہ مائل بہ اقبال ہوا، اس طرح وہ آزاد مملکت میں تفہیم اقبال کے بنیاد گزار ہیں اور اقبال شناسی کی شاہ راہ کے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، اقبال شناسی کی فضائے بسیط میں کہ ان کی آواز بانگ رحیل سے کم نہیں ہے، ان کے بعد مجنوں گورکھ پوری کی اختلافی کتاب منظر عام پر آئی، یہ بھی مستقل کتاب نہیں ہے بلکہ بی اے کے کلاس نوٹس ہیں جنھیں مرتب کر دیا گیا تھا، ۱۹۵۰ء میں حبیب النساء بیگم کی ''تصوف اقبال'' شائع ہوئی، ان تصانیف کی حیثیت مواد وضخامت کے اعتبار سے کچھ وقیع نہیں ہے، ۱۹۵۱ء میں اقبال سنگھ کی (The Ardent Pilgrim) شائع ہوئی، اقبال سنگھ اشتراکی نظریہ کے حامل تھے، لہٰذا اقبال کو اس نظر سے دیکھنے میں ان کے پاس جواز تھا، اس سے قبل مجنوں گورکھ پوری نے اقبال پر مارکسی نقطہ نظر سے تنقید کی تھی، ان کے بے جا اور نازیبا اعتراضات نے اقبال کی تفہیم میں گمرہی کا در کھولا اور پہل کی، میرا خیال ہے کہ مولانا مرحوم کی کتاب کے بعد ان کے مندرجات نے مجنوں گورکھ پوری کو مشتعل کیا اور اقبال سنگھ بھی کسی نہ کسی عنوان سے متاثر ہوئے، اس لیے کہ اعظم گڈھ اور گورکھ پور میں زمینی اور زمانی فاصلہ کم سے کم تھا، یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ آزادی کے بعد ترقی پسند ادیبوں کو اشتراکی وفاداری کے ساتھ حکومت وقت کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے اقبال سے بہتر ہدف نہیں ہوسکتا تھا، سجاد ظہیر خداداد مملکت کو توڑنے کے لیے عزم سفر کر چکے تھے، بلکہ وہ تو کسی اور کے فرستادہ تھے جس نے انہیں بعد میں اماں بھی بخشی، سردار جعفری اس کوچے کے دوسرے نوآموز راہ رو تھے، انہوں نے ترقی پسند ادب میں اقبال کے خلاف مجنوں کی مہم کو مہمیز کیا اور سرکار سے صلۂ صریر خامہ بھی وصول کیا، وفاداران ادب کا ایک طائفہ وجود میں آیا، اختر حسین، سبط حسین، اختر حسین تلہری جیسے بہت سے کوتاہ بینوں کی کمیں گاہیں آباد ہوئیں، یہ بات بڑی حیرت خیز ہے کہ اقبال کے معترضین ایک خاص نظریہ، نیت اور نہاد سے ہی تعلق رکھتے ہیں، اقبال سے ذہنی قربت رکھنے والوں کو بھی معتوب گردانا گیا، فیض کی مثال سامنے ہے، وہ اقبال کے بہ وجوہ معترف تھے، سردار جعفری نے فیض کی ترقی پسندی کے باوجود انہیں نشانہ بنایا، اگرچہ وقت نے ثابت کر دیا کہ فنی اعتبار سے سردار جعفری فیض کی گزرگاہ خیال کے روبرو غبار رہ گزر کی حیثیت بھی نہیں رکھتے، اس سیاق ولحاق میں مولانا کی تحریر اور تعبیر کی معنویت اور معقولیت فکر

طلب ہے اور نئی تفہیم کا تقاضا کرتی ہے، اقبال شناسی میں مولانا محترم کے اکتسابات کا صحیح طور پر ابھی تک اعتراف نہیں کیا گیا ہے اور نہ ہی ان کی ناقدانہ بصیرت کا تجزیہ ہی ہوسکا ہے، ایسے میں یہ گنجائش ہے کہ راقم یہ معروضہ پیش کرے کہ علامہ شبلی کی ادبی خدمات کے روبرو اگر کوئی شخصیت لائی جاسکتی تو موصوف ہی قرار دیے جائیں گے، علامہ شبلی نے شعرالعجم کے ساتھ موازنہ لکھا جو ایک صنف شاعری سے متعلق دو ہم عصروں کے تقابل کی ابتدا تھی، کسی ایک صاحب فن پر مستقل تصنیف سامنے نہ آسکی، سوانح مولانا روم ایک سوانحی کتاب ہے اور مولانا روم کی تخلیقات پر تنقید و تجزیہ سے زیادہ سروکار نہیں رکھتی، اس اعتبار سے عبدالسلام ندوی کو ایک گونہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے اپنے دور کے سب سے بڑے مفکر شاعر کے فنی اسالیب کو انتقاد کے میزان پر پرکھنے کی کوشش کی ہے، اس سے بھی صرف نظر کرتے ہوئے یہ استصواب تو کیا ہی جاسکتا ہے کہ علمائے کبار میں سے تقریباً سبھی نے ہمارے اردو شعر و ادب کے کسی منفرد شاعر پر جنبش قلم کو محفوظ رکھا، سید سلیمان ندوی مرحوم نے فارسی ادب کے شاہکار فن کار عمر خیام کو زندگی جاوداں عطا کی، اقبال کی نظر میں وہ ''علوم اسلامی کی جوئے شیر کا فرہاد'' تھے، لیکن سید صاحب نے توجہ نہ دی، دوسرے مقتدر عالم مولانا ابوالحسن علی ندوی کی گراں مایہ تصنیف روائع اقبال یا نقوش اقبال کا نام لیا جاسکتا ہے، یہ ان کے مختلف مقامات پر دیے گئے خطبات اور چند نظموں کے تجزیہ پر مشتمل ہے، تاہم یہ اقبال کامل جیسی مستقل کتاب کے زمرے میں نہیں، اسی طرح مولانا عبدالمالک آروی نے ایک مختصر کتاب اقبال کی شاعری پر تالیف کی جو اقبالیات میں معروف مقام کی حامل نہیں ہے، علما کے التفات نظر کے برعکس علامہ ہم عصر علما کی قدرشناسی کو شرف و سعادت سمجھتے رہے، سید صاحب کے علاوہ مولانا مودودی، مولانا عمادی، مولانا انظر شاہ کشمیری وغیرہ سے ان کے خاص مراسم تھے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اقبال کامل کے مسودے کو پڑھا تھا، وہ ذی فکر ادیب و دانشور تھے، تحقیق و تصنیف سے شغف رکھتے تھے، الٰہیات اور انگریزی ادب پر بھی خاطر خواہ نظر تھی، وہ بھی متوجہ نہ ہوسکے، اگرچہ انہوں نے اپنی تفسیر میں سورہ شعرا کی اس آیت کریمہ '' وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُنَ '' کی تفسیر میں اقبال سے اپنی فکری اور جذباتی عقیدت کا اظہار کیا ہے، یعنی انہوں نے حضرت حسان بن ثابت اور علامہ اقبال کی شاعری کو اس تاکیدی ارشاد سے مستثنیٰ قرار

دیا ہے، اگر وہ وقت نکال لیتے تو اقبال کے فکر و فلسفے اور فنی انتقاد پر ایک گراں قدر تحریر ہماری رہنمائی کرتی، مفقود و معدوم پر گفتگو کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

موجود پر التفات اور استصواب چاہتا ہوں، اردو شعریات کی بازآفرینی میں مولانا کی دونوں کتابوں کو علمی بلندی و برنائی حاصل ہے، ''شعرالہند'' اور ''اقبال کامل'' کے مندرجات اور مباحث بے حد مفید اور مطالعہ ومحاسبہ کے لیے چراغ رہ گزر کی حیثیت رکھتے ہیں، شعرالہند اقبال کامل سے چند برس پہلے لکھی گئی، اسی کی چوتھی اشاعت ۱۹۴۹ء میں سامنے آئی اور ۱۹۴۸ء میں اقبال کامل شائع ہوئی، آٹھ سال بعد مولانا کا انتقال ہوا، ۱۹۶۴ء میں دوسرا ایڈیشن منظر عام پر آیا جس میں کوئی اضافہ نہ تھا۔

یہاں اپنی ایک حیرت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں، شعرالہند میں ابتدا سے لے کر معاصر شعرا کا ذکر ملتا ہے، جگر، اصغر سے لے کر سیماب اور حفیظ جونپوری کا بار بار حوالہ ملتا ہے لیکن اقبال کا تذکرہ نہیں ملتا اور نہ ہی اقبال کے اشعار زیر بحث آئے ہیں، دو چار اشعار کے علاوہ دونوں جلدیں خاموش ہیں، جلد اول میں انگریزی شاعری کے تراجم کے متعلق شیخ غلام محی الدین کی تالیف کے تعارف میں اقبال کی تین نظموں (پیام صبح، پہاڑ اور گلہری، ماں کا خواب) کا حوالہ ہے اور یہ بھی مذکور ہے کہ انگریزی شاعری کے تراجم کی بدولت اردو میں تشبیہات واستعارے میں فنی وسعت پیدا ہوئی، یہ شعر بھی نقل کیا گیا ہے:

پکارے اس طرح دیوار گلشن پر کھڑے ہوکر چٹک او غنچۂ گل تو موذن ہے گلستاں کا

جلد دوم میں اردو شاعری کے اصناف کا تعارف وتجزیہ خاصے کی چیز ہے، ان میں بھی ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں، ایک عنوان ہے فلسفیانہ شاعری، یہاں بھی اقبال کا دور دور تک کوئی ذکر نہیں ہے۔

در حیرتم کہ پائے گفتارش از کجاست

شاید شعرالہند کی تسوید کے وقت اقبال کامل کا مجوزہ منصوبہ تیار کیا ہو اور اقبال کے بارے میں اسے مختص کرلیا ہو، اسے میری خوش گمانی بھی کہہ سکتے ہیں، بہ ظاہر اور کوئی سبب نظر نہیں آتا، بہر صورت راقم کے لیے یہ مسئلہ فکر طلب ہے، یہ بھی سچ ہے کہ مذکورہ تصنیف میں کئی

قابل ذکر اہل قلم کے بارے میں تفصیلات نہیں ملتیں، اقبال کامل میں ابواب کی تقسیم موضوع کے اعتبار سے مفید اور منطقی ہے، سوانح حیات، تصنیفات، اردو شاعری، فارسی شاعری، کلام اقبال کی مقبولیت، فلسفۂ خودی و بے خودی وغیرہ سرخیوں کے تحت ذیلی عنوانات میں سلیقہ وسنجیدگی کا اہتمام اس کی افادیت میں چند در چند اضافہ کا باعث ہے۔

یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ آج اقبال پر لکھنا بہت آسان ہے، تقریباً تین ہزار کتابوں کی موجودگی میں ان کے فکر وشعر کی تقریباً ہر جہت پر مواد موجود ہے، اقبال کے شب وروز کے معمولات سے لے کر درونِ خانہ اور اندرونِ فکر کے سیل معانی کی سراغ رسانی آسان ہے، مولانا نے ۱۹۴۸ء تک معلومات فراہم کرنے میں جس جگر سوزی سے کام لیا ہے وہ حیرت خیز ہے۔

سوانحی تذکرے میں اقبال کے اشعار کے حوالے سے یہ حصہ دلآویزی کا مرقع بن گیا ہے، کلام اقبال سے ان کی حیات کے ماہ وسال یا اہم واقعات کا ایک فکر انگیز تاریخی یا واقعاتی گوشوارہ تیار کیا جا سکتا ہے، مثلاً مولانا نے ان کے اجداد پر گفتگو کرتے وقت

میں اصل کا خاص سومناتی   آبا مرے لاتی و مناتی
تو سید ہاشمی کی اولاد   مری کفِ خاک برہمن زاد
ہے فلسفہ میرے آب وگل میں   پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں

یا   برہمن زادہ رمز آشنائے روم وتبریز است

یا   مولانا میر حسن سے جو نسبت ہے

وہ شمع بار گہ خاندانِ مرتضویؓ   رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی   بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو

والدہ کے انتقال، پروفیسر آرنلڈ کی رخصت، مسولینی سے ملاقات، سفر یورپ، قرطبہ کی زیارت، سفر افغانستان وغیرہ جیسے سیرت وسوانح کے واقعات کو اشعار سے ہم آہنگ کر کے حیات وممات کے خشک تذکرے کو زیادہ دل کش بنا دیا گیا ہے، مولانا نے لکھا ہے:

''اپنی ابتدائی زندگی میں وہ متشکک تھے''۔

اور بے خودی کے اشعار سے استنباط کیا ہے:

سالہا بودم گرفتار شکے از دماغِ خشک من لا ینفکے
حرفے از علم الیقیں نا خواندۂ در گماں آباد حکمت ماندہ

یہ استنباط غلط ہے، اقبال نے حضور کونینؐ کی بارگاہ میں اپنی عاجزی کا ذکر کیا ہے، وہ زندگی کے کسی دور میں تشکیک میں مبتلا نہیں ہوئے، ہر دور کے اشعار جو تصور توحید اور پیغمبر اعظم و آخرؐ کی بارگاہ میں ہدیۂ عقیدت کے طور پر پیش کیے ہیں، ان کے موحد کیش ہونے کی دلیل ہیں، ہاں ایک دور ایسا ضرور گزرا ہے جب وہ وجودی افکار سے مغلوب تھے، یہ زمانہ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک کا ہے۔

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی پروانے کو تپش دی جگنو کو روشنی دی
حسن قدیم کی یہ پوشیدہ اک جھلک تھی لے آئی جس کو قدرت خلوت سے انجمن میں

ہاں ایک دوسری منزل بھی ہے:

میتوانی منکرِ یزداں شدن منکر شان نبیؐ نتواں شدن

یہاں بھی تصور الٰہ اور رسالتؐ کا استحکام و استقرار ہی ہے، مولانا نے اس طرف توجہ نہیں دی کہ شاعرانہ عجز بھی ایک طریق کلام ہے، بعض ناقدین کو اس طرح کے بیانات نے غلط نتائج اخذ کرنے کے لیے آمادہ کیا، مثلاً:

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبال تو

پر تضاد فکر کی طویل بحث جاری رہی اور اب بھی بعض لوگ نازش ہائے بے جا سے دوچار ہیں، اشعار کی غلط تاویلات کا ایک انبار اقبالیاتی مطالعے میں گمرہی پھیلانے کا موجب بنا ہے، اجتماعی فکر کو نظر انداز کر کے لخت لخت کر کے تفہیم پیچیدگیاں پیدا کرتی ہے، قاری یا مبصر کی غلط تعبیر سے ہر طرح کے اشکالات کا امکان ہے۔

مصنف محترم نے اغلاط کا ایک باب بھی قائم کیا ہے، جس میں اقبال کی زبان و بیان میں تذکیر و تانیث کے علاوہ محاوروں کے استعمال میں کوتاہیاں زیر بحث لائی گئی ہیں، کچھ درست ہیں اور زیادہ تر نامناسب گرفت کی زد میں ہیں، ان کا بیان شاملِ متن ہے:

''چوں کہ کسی نے ان غلطیوں اور خامیوں کو تفصیل کے ساتھ نہیں

دکھایا ہے، اس لیے ہم خود اس نا گوار فرض کو ادا کرتے ہیں''۔ (ص ۲۴۹)

آنکھ وقفِ دید تھی لب مائلِ گفتار تھا

مصنف کا خیال ہے کہ چوں کہ لب دو ہوتے ہیں، لہذا لب مائل گفتار تھے، ہونا چاہیے تھا، اس اعتراض میں صداقت نہیں ہے، لب واحد ہے، لبوں یا لباں جیسی جمع کی صورت نہیں ہے کہ فعل بھی جمع ہو، اسی طرح وہ طلب خو پر معترض ہیں، کیوں کہ ان کے بہ قول یہ بدنما اور غیر مستعمل ترکیب ہے، نشہ پلا کے گرانا پر بھی اعتراض ہے کہ یہ لکھنؤ کا محاورہ نہیں ہے، یہ بھی لکھا ہے کہ غالباً پنجابی محاورہ ہوگا، پنجاب میں ہی نہیں یہ محاورہ اب تو عام ہے، کدو کو غیر فصیح کہا ہے:

مرا سبو چہ غنیمت ہے اس زمانے میں کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو

حالانکہ یہاں کدو بہت ہی معنی خیز ہے اور پھر ردیف کی رعایت بھی دیکھیے بعض حلقوں میں اقبال کی زبان دانی پر بڑے رکیک حملے کیے گئے، خاص طور پر لسانی کم نگاہی کا شکوہ کیا گیا، اس عصبیت کے پس پردہ ایک دوسرا جذبہ بھی کارفرما تھا، تخلیق میں سب پر سبقت حاصل کرنے والا شاعر زمین غیر ذی زرع اور غیر کفو میں کیوں پیدا ہوا، ہم فلسفی شاعر کے نقطۂ نظر کو فراموش کر دیتے ہیں کہ اقبال کے پیش نظر ان کے مخصوص خیالات کا ابلاغ اساسی اہمیت رکھتا تھا۔

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں کوئی دل کشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی

مصنف نے اقبال کی تصانیف کے تعارف میں ایک باب قائم کیا ہے، ان کی سبھی تخلیقات پر اختصار سے خیالات پیش کیے گئے ہیں لیکن حیرت یہ ہے کہ اقبال کے فکر و فلسفے کی سب سے اہم کتاب ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا ہے، حالانکہ انہوں نے ایران میں مابعدالطبیعات کے ارتقا کا حوالہ انگریزی کتاب کہہ کر دیا ہے لیکن اس طرح کی دو چار فروگذاشتوں سے کتاب کی افادیت کم نہیں ہوتی، تنقید بہ قول صاحب غیاث اللغات ''نقد ستانیدن'' و ''کاہ از دانہ جدا کردن'' ہے۔

مولانا کی تنقیدی بصیرت اور تخلیق کی دروں بینی کو آفریں کہتا ہوں کہ انہوں نے شعری تخلیق کی پراسرار کیفیات کی تفہیم میں جس آگہی کا مظاہرہ کیا ہے وہ قابل ستایش ہے، وہ تنقید کے مروجہ دبستانوں سے وابستہ نہ تھے اور نہ کسی نظریہ کی ادعائیت ہی تھی، یہ مشرقی اصول نقد کو بروئے کار لا کر

بیسویں صدی کے مفکر شاعر کے فکروفن کو صحیح تناظر میں پیش کرنے کی اہم مثال ہے، خاص طور پر کتاب کے آخری ابواب میں اردو شاعری اور فارسی شاعری کا تجزیہ اقبال کے فنی ارتکاز کا نقطۂ پرکار رہے اور مولانا کے شعری عرفان کی صبح درخشاں بھی ہے، کیوں کہ انہوں نے صرف بیسویں صدی ہی نہیں بلکہ کئی صدیوں پر محیط ایک مجدد فکر کے فلسفہ وشعر پر تنقید وتحسین کی جو جرأت کی ہے وہ بڑے مطالعہ ومشاہدہ کا تقاضا کرتی ہے، وہ جرأت پیکر خاکی میں نفس جبرئیل پیدا کرنے کی آرزو سے کم نہیں ہے کیونکہ تخلیق کے حرف راز کی تعبیر وتشریح کے لیے جنوں خیز حوصلہ چاہیے، وہ جنوں جو شرر سے شعلہ تک رسائی حاصل کرتا ہے اور فلک تاب کہکشاں پر کمندیں ڈالنے کے لیے ولولۂ شوق اور پر پرواز بھی بخشتا ہے۔

در جنوں از خود نہ رفتن کار ہر دیوانہ نیست

ناسازگار حالات میں اقبال شناسی کی پہل ایک دیوانگی سے کم نہ تھی، جس پر سینکڑوں فرزانگی قربان کی جاسکتی ہیں، ناموس دین ودانش کی نگہبانی کے لیے مولانا محترم نے قلم کی حرمت کو آبرو بخشی اور اپنی تحریروں سے ہماری توقیر بڑھا گئے، صلے وستایش سے صرف نظر کیجیے، موصوف کی خدمات ہمارے جذبۂ استحسان واعتراف کو اب بھی دعوت نظر دے رہی ہیں کہ ہم بھی حریف سنگ ہوں، اگر انبیا کی وراثت کے امین علما ہیں تو پھر عالموں کے اثاثے کی حفاظت کس کے ذمے ہوگی؟

اقبال کامل

مولانا عبدالسلام ندوی

علامہ اقبال کے فلسفہ وشاعری پر اگرچہ بہ کثرت کتابیں، مضامین اور رسالے شائع ہوئے لیکن ان سے ان کی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایاں نہ ہوسکی، یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، اس میں ان کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ ان کے شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل کی گئی ہے، ان کی اردو شاعری، پھر فارسی شاعری پر ان کے بہترین اشعار کے انتخابات کے ساتھ مفصل تبصرہ کیا گیا ہے اور ان کے کلام کی خوبیاں دکھائی گئی ہیں، ادہر کافی عرصہ سے "اقبال کامل" کا ایڈیشن ختم ہوگیا تھا مگر اب اس کا جدید کمپیوٹر سے کتابت شدہ، دیدہ زیب ایڈیشن چھپ کر آچکا ہے۔ قیمت =/۱۸۰ روپے

علامہ شبلی کے تعلیمی افکار اور عصر حاضر میں ان کی معنویت

پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی

[مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم (۳/ جولائی ۱۹۳۷ء - ۲/ فروری ۲۰۰۸ء) کی دارالمصنّفین سے شائع شدہ آخری کتاب "مسلمانوں کی تعلیم" اپنے موضوع پر نہایت عالمانہ و محققانہ مطالعہ ہے، اس میں اسلامی تاریخ کے اولین ادوار میں مسلمانوں کی شان دار علمی روایات، اسلام اور تعلیم نسواں، مسلمانوں کا قدیم طرز تعلیم اور اس میں اصلاح کے امکانات، موجودہ دور میں دینی مدارس کی اہمیت و معنویت، مسلمان اور عصری تعلیم کے تقاضے، دعوت دین اور مدارس دینیہ کی ذمہ داریاں اور علامہ شبلی کے تعلیمی افکار جیسے اہم موضوعات زیر بحث آئے ہیں، اس کتاب کے مطالعہ سے علامہ شبلی کے تعلیمی نظریات کے بعض نہایت اہم پہلو راقم کے سامنے آئے، اس کے مباحث کی روشنی میں اور بعض دیگر کتب سے استفادہ کرتے ہوئے موجودہ دور میں علامہ شبلی کے تعلیمی افکار کی معنویت اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے، یہ دراصل مولانا مرحوم کی ایک وقیع علمی خدمت کے حوالہ سے انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کی ایک ادنیٰ کاوش ہے۔ظ-ا]

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ - ۱۹۱۴ء) برصغیر ہند و پاک کی ان نامور شخصیات اور ممتاز دانشوروں میں شامل ہیں جن کی زندگی کا بیش تر حصہ ملی وقومی فلاح و بہبود کے کاموں میں بسر ہوا اور جنہوں نے اپنی صلاحیتوں کا بہترین مصرف انہی کاموں کو سمجھا، مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی

شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔

کے مسائل میں تعلیم کے مسئلہ میں علامہ شبلی نے خاص دل چسپی دکھائی، انہوں نے تعلیم کو خصوصی اہمیت اس وجہ سے دی کہ میرے بزرگ و مربی اور تقریباً نصف صدی تک علامہ شبلی کے سب سے قیمتی یادگار دارالمصنّفین کی بے لوث خدمت انجام دینے والے مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم کے الفاظ میں ''ان کے نزدیک یہی قوم کی وقعت وعظمت کا پہلا زینہ ہے، اس سے اس کی ذہنی، دماغی اور اخلاقی تربیت ہوتی ہے اور اسی کی بدولت اس کو ایسے لائق و قابل افراد ملتے ہیں جو اسے قعرِ مذلت سے نکال کر بام عروج تک پہنچا دیتے ہیں'' (۱)، مولانا مشرقی تعلیم میں رچے بسے تھے، عصری علوم پر بھی ان کی نظر تھی، مدارس اور جدید تعلیمی اداروں کو بہت قریب سے دیکھنے، ان کے نظام کو گہرائی سے سمجھنے اور ان کے نصاب وطرز تدریس کا بغور جائزہ لینے کا موقع ملا تھا، وہ مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر مسلسل غور وفکر کرتے رہتے، وہ جہاں جاتے قدیم وجدید دونوں قسم کے اداروں کے نظام تعلیم وتربیت سے واقفیت حاصل کرنے میں بڑی دل چسپی لیتے، ان کی خوبیوں وخرابیوں کا پتہ لگاتے اور اصلاح کے امکانات کی نشان دہی کرتے، اس طرح تعلیم کے مسائل پر ان کی نظر بڑی وسیع و گہری تھی اور اس ضمن میں جو افکار وخیالات انہوں نے پیش کیے وہ ان کے وسیع مطالعہ، طویل تجربے، تعلیمی منظر نامہ کے گہرے مشاہدے پر مبنی نتائج تھے، ان کے یہ تعلیمی افکار نہ صرف ان کے زمانہ میں بہت اہم، مفید و برمحل سمجھے جاتے تھے بلکہ آج کے دور میں بھی ان کی معنویت وافادیت برقرار ہے، اس پہلو سے ان کے تعلیمی افکار کا ایک مختصر مطالعہ پیش نظر ہے اور اس مضمون میں خاص طور سے اس پہلو کو اجاگر کیا جائے گا کہ مسلمانوں کی تعلیم کے مقاصد کے باب میں ان کا کیا نقطۂ نظر تھا اور ان مقاصد کے حصول کے لیے انہوں نے کیا لائحہ عمل پیش کیا۔

علامہ شبلی کے تعلیمی افکار کے تفصیلی مطالعہ سے پہلے ان کے کچھ اہم نکات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے جو موجودہ دور میں بھی بڑی اہمیت وافادیت کے حامل ہیں

۱- مسلمانوں کی تعلیم کا مسئلہ ہر شخص کا انفرادی مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ براہ راست ان کی ملی زندگی اور اجتماعی مسائل سے وابستہ ہے، اس لیے ان کی تعلیم وتربیت کے اہتمام میں اس نکتہ کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

۲- قدیم و جدید دونوں تعلیم کی ضرورت و افادیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن موجودہ صورت حال میں دونوں میں اصلاح کی ضرورت ہے۔

۳- جدید علوم وفنون کی اشاعت اور عصری تعلیم کے پروان چڑھتے ہوئے ماحول میں دینی تعلیم کی اشاعت، توسیع اور استحکام کی ضرورت اور بڑھ گئی ہے تا کہ دینی علوم کے ماہرین کثیر تعداد میں پیدا ہوسکیں اور وہ ملی و اجتماعی مسائل کے حل میں کارگر و مفید ثابت ہوں۔

۴- قدیم وجدید تعلیم میں اس طور پر اصلاح درکار ہے کہ دینی مدارس کے نصاب میں کچھ عصری علوم کے مضامین شامل کیے جائیں اور مسلمانوں کی عصری تعلیم گاہوں میں اسلامیات کی تدریس کا نظم قائم ہو۔

۵- دینی تعلیم کے ساتھ جس جدید مضمون کی تعلیم سب سے زیادہ ضروری ہے وہ انگریزی زبان ہے، اس لیے کہ اس کے بغیر نہ تو اسلام پر مغربی اسکالرس اور جدید دانش وروں کے اعتراضات سے واقفیت ہوسکتی ہے اور نہ ان کے جواب کی اہلیت پیدا ہوسکتی ہے، تیسرے اسلام سے متعلق انگریزی میں صحیح و مستند لٹریچر کی تیاری کے لیے بھی اس زبان کی مہارت ضروری ہے ورنہ جدید تعلیم یافتہ حضرات میں اسلام و اسلامی تعلیمات کے مطالعہ کی طلب رکھنے والے دوسروں کے تیار کردہ لٹریچر پر انحصار کریں گے اور ان کے سامنے اسلام و اسلامی شریعت کی صحیح ترجمانی نہیں ہو پائے گی۔

۶- تعلیم کا ایسا نظام وضع کیا جائے کہ مختلف فنون کی اختصاصی تعلیم کا اہتمام ہو اور طلبہ اپنی دل چسپی و رجحان کے مطابق ان میں سے کسی ایک میدان کو منتخب کرسکیں، اس لیے کہ متخصّصین کی ضرورت روز بہ روز بڑھتی جارہی ہے۔

۷- طلبہ کی ذہنی صلاحیتوں کو جلا بخشنے اور ان کی قوت استدلال کو تیز کرنے کے لیے درسی تعلیم کے ساتھ انہیں بحث ومباحثہ کا عادی بنایا جائے، جیسا کہ قدیم طرز تعلیم میں رائج تھا۔

۸- قدیم تعلیم میں اصلاح کی ضرورت سے انکار نہیں لیکن بلا ترمیم و اصلاح بھی یہ افادیت سے خالی نہیں، اس لیے کہ اس تعلیم سے مستفیض ہونے والوں سے بہت سی ملی و اجتماعی ضروریات وابستہ ہیں۔

۹- جدید تعلیم کی بڑھتی ہوئی ضرورت وافادیت کے باوجود مسلمانوں کو ایسے تعلیمی نظام کی زیادہ ضرورت ہے جس میں اسلامیات کا حصہ غالب ہو اور بقدر ضرورت کچھ عصری مضامین کی تعلیم کا بھی اہتمام ہو۔

۱۰- قدیم و جدید دونوں تعلیم کا دائرہ کار الگ ہے، دونوں تعلیم کے فیض یافتگان میں اجنبیت کم کرنے اور تال میل پیدا کرنے کی ضرورت ہے تاکہ دونوں مل کر مسلمانوں کی اجتماعی ضروریات پوری کرسکیں اوران کی فلاح و بہبود کے کاموں میں ایک دوسرے کو تعاون دے سکیں۔

علامہ شبلی کے تعلیمی افکار کس حد تک عصری تقاضوں کے آئینہ دار ہیں، اس کا ہلکا سا اندازہ ان کے اس تاثر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اب یہ بات مختلف فیہ نہیں رہ گئی کہ جدید تعلیم ضروری ہے کہ نہیں، اگر کوئی اس ضرورت کا انکار کرتا ہے تو اس کی بات قابل توجہ نہیں، اس لیے کہ بدلے ہوئے حالات اور جدید دور کے ابھرتے ہوئے مسائل کے تحت یہ ضرورت امر مسلم بن چکی ہے، اس سے انکار امر بدیہی سے انکار ہوگا۔ (۲)

اب رہا یہ سوال کہ مسلمانوں کے لیے قدیم تعلیم ضروری ہے کہ نہیں؟ اس سوال کے جواب میں انہوں نے تین سوالات اٹھائے ہیں جو بڑے اہم ہیں اور انہی کے جواب پر غور وفکر میں اصل سوال کا جواب مضمر ہے، یعنی قدیم تعلیم بھی ضروری ہے، اس لیے کہ اس میں مذہبی تعلیم لازمی عنصر کے طور پر ہے اور اس کے بغیر مسلمانوں کی تعلیم مکمل ہو ہی نہیں سکتی، وہ سوالات یہ تھے:

۱- کیا مسلمانوں کی قومیت مذہب کے سوا کچھ اور ہے؟

۲- اگر نہیں تو مذہب کے قیام کے بغیر ان کی قومیت کیوں کر قائم رہے گی؟

۳- اگر مذہب کی ضرورت ہے تو مذہبی تعلیم قدیم تعلیم کے بغیر کیوں کر ممکن ہے؟ (۳)

یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا تھا کہ اگر انگریزی یا جدید تعلیم کے ساتھ کچھ مذہبی تعلیم شامل کردی جائے تو کیا اس سے مسلمانوں کی تعلیم کا مسئلہ حل نہیں ہوجائے گا، اس کا جواب انہوں نے اس طور پر دیا کہ مسلمانوں کے یہاں تعلیم کے اہتمام سے مقصود اسلامی علوم کا تحفظ، اسلامی عقائد و احکام کی تشریح و ترجمانی اوران پر اعتراضات کے ازالہ کی صلاحیت پیدا کرتا ہے اور محض جزوی طور پر دینی تعلیم سے اس اہلیت کا پیدا ہونا مشکل ہے، وہ دوٹوک انداز میں یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا

اس قدر تعلیم سے قرآن وحدیث کی حفاظت ہوسکتی ہے، کیا اس درجہ تعلیم یافتہ اسلام کے مشکل مسائل کی تشریح کر سکتے ہیں، دوسرے کیا اس قدر تعلیم پائے ہوئے لوگ امام، خطیب و مفتی کے فرائض انجام دے سکتے ہیں اور کیا عوام پر ان کا کوئی مذہبی اثر قائم ہوسکتا ہے (۴)، اس سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ علامہ شبلی قدیم تعلیم کا بہت ہی وسیع تصور رکھتے تھے اور مسلمانوں کے لیے ایسے نظام تعلیم کے قیام کے خواہاں وکوشاں تھے جس سے فیض اٹھانے والے اسلامی ومشرقی علوم کے ماہر ہوں، اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ دینی تعلیم یا مدارس کا جو نظام چل رہا تھا وہ اس سے مطمئن تھے اور اس میں کسی اصلاح وترمیم کی ضرورت نہیں محسوس کرتے تھے، اس باب میں ان کا تاثر یہ تھا کہ ''قدیم تعلیم میں سخت اصلاح واضافہ کی ضرورت ہے لیکن افسوس ہے کہ بڑے بڑے مقدس علما اب تک اس ضرورت کے قائل نہیں''، ہم ان سے ان سوالات کے جواب چاہتے ہیں:

☆ یورپ کے مصنّفین مذہب پر جو حملے کر رہے ہیں اس سے واقف ہونے کی ضرورت ہے کہ نہیں۔

☆ اگر علما خود ان خیالات سے واقف نہ ہوں گے تو کیا انگریزی خواں مسلمانوں میں ان خیالات کا شائع ہونا کوئی روک سکتا ہے۔

☆ مذہب پر عموماً اور مذہب اسلام پر جو اعتراضات یورپ کے لوگ کر رہے ہیں ان کا جواب دینا کس کا فرض ہے۔

☆ علما جب تک ان خیالات سے واقف نہ ہوں گے جواب کیوں کر دے سکیں گے۔

☆ کیا علمائے سلف نے یونانیوں کا فلسفہ نہیں سیکھا تھا اور ان کے اعتراضات کے جواب نہیں دیے تھے، اگر اس وقت اس زمانہ کا فلسفہ سیکھنا جائز تھا تو اب کیوں جائز نہیں۔ (۵)

آخر میں علامہ شبلی نے خود ہی فرمایا کہ ان سوالات کا جواب اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ تعلیم قدیم کے ساتھ جدید خیالات سے واقف ہونے اور انگریزی زبان اور انگریزی علوم پڑھنے کی ضرورت ہے، دینی مدارس کے فارغین یا علما کے لیے انگریزی زبان کی بخوبی واقفیت کو وہ اس پہلو سے بھی ضروری سمجھتے تھے کہ موجودہ صورت حال میں اسلامیات پر اچھے و مستند لٹریچر کی ضرورت بڑھ گئی ہے، اس لیے اب مسلمانوں میں جدید تعلیم کی اشاعت کو کوئی روک نہیں سکتا،

جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی قرآن وحدیث کو جاننے اور سمجھنے کا شوق رکھنے والے اور اسلامی احکام سے واقفیت کی طلب رکھنے والے کم نہیں ہیں، جب انہیں مسلم اسکالرس کی تیار کردہ کتابیں نہیں ملیں گی تو دوسروں سے اپنی پیاس بجھائیں گے، قرآن کریم سمجھنے کا شوق ہوگا تو سیل (Sale) کا ترجمہ پڑھیں گے، فقہ اسلامی جاننا چاہیں گے تو ہملٹن (Hamilton) کے ترجمہ ''ہدایہ'' پر انحصار کریں گے، پھر اس صورت حال پر علامہ نے چبھتا ہوا تبصرہ فرمایا ہے کہ اب نئے تعلیم یافتوں کی مذہبی واقفیت کا مدار انگریزی کی کتابوں اور اسلامی کتابوں کے ترجمے پر رہ جائے گا تو اس وقت ہمارے مذہبی علوم کی کیا حالت ہوگی، دوسرے یہ سوال بھی اٹھایا کہ کیا یہ کام علما کا نہیں ہے کہ وہ انگریزی میں مفید اسلامی لٹریچر تیار کریں......(۶)، یہاں ندوہ کے نصاب میں انگریزی زبان کی تعلیم کی شمولیت پر مولانا سید سلیمان ندوی کے سوال اور علامہ شبلی کے جواب کو نقل کرنا بہت برمحل معلوم ہوتا ہے، ''حیات شبلی'' کے مصنف گرامی تحریر فرماتے ہیں:

> ''غالباً ۱۹۰۸ء کی بات ہے میں نے مولانا سے عرض کیا کہ عربی کے ہر طالب علم کو انگریزی پڑھنے پر کیوں مجبور کیا جاتا ہے، مثلاً جو لوگ فقیہ بننا چاہتے ہیں ان کو انگریزی کیا کام آئے گی، فرمایا عجیب بات کہتے ہو، اگر فقہا انگریزی جانتے اور ہمارے فقہ کو انگریزی میں منتقل کر سکتے تو ہدایہ وغیرہ کے انگریزوں اور غیر مسلموں کے کیے ہوئے غلط سلط ترجمے آج عدالتوں میں سند نہ قرار پاتے''۔(۷)

یہ بات بڑی اہم ہے کہ دینی تعلیم کے نصاب میں اصلاح وترمیم کی سخت ضرورت محسوس کرنے کے باوجود مولانا شبلی برملا یہ فرماتے تھے کہ موجودہ شکل میں (یعنی بلا اصلاح و ترمیم) بھی مدارس کی تعلیم افادیت سے خالی نہیں، اس لیے کہ مذہبی کاموں کا دائرہ بہت وسیع ہے، دیہات کے مسلمانوں میں احکام اسلام کا پھیلانا خود ایک بہت بڑا کام ہے، سینکڑوں علما و واعظین کی ضرورت ہے، امامت، خطابت وفتوی نویسی کے لیے بھی بہت سے باصلاحیت افراد درکار ہیں، یہ سب کام قدیم تعلیم یافتہ حضرات ہی انجام دے سکتے ہیں، اس لیے تقسیم کار کے اصول کی رو سے یہ امور ان ہی کے ہاتھوں میں رہنے چاہیے، ان کی اعانت وتعظیم کی جانی چاہیے اور کسی صورت میں دینی تعلیم والوں کو بے کار نہیں سمجھنا چاہیے۔(۸)

مدارس میں انگریزی زبان کی تعلیم کے معقول نظم کے علاوہ علامہ شبلی نے ان اداروں کی تعلیم کو مزید مفید و کارگر بنانے کے لیے اس پر زور دیا کہ ہندی و سنسکرت، جدید فلسفہ اور علوم طبیعیہ کی کتابیں بھی داخل نصاب کی جائیں اور انہوں نے ندوۃ العلما میں اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی کی، ان سب کے علاوہ ان کی یہ رائے بھی بہت اہم تھی کہ نئی صورت حال کے تحت مدارس میں طریق تعلیم و تدریس کو تبدیل کیا جائے، جدید دور کے تقاضوں کی روشنی میں طلبہ کو نئے علوم سے بھی روشناس کرایا جائے اور نظام تعلیم کی دوئی کو ختم کر کے قدیم صالح اور جدید نافع کے امتزاج کے طریقہ کو اپنایا جائے (۹)، علامہ شبلی نے تعلیم کے اعلا مرحلہ میں اختصاص (Specialization) کے پہلو پر خاص زور دیا، یعنی مختلف فنون میں علاحدہ علاحدہ اختصاصی تعلیم کا اہتمام کیا جائے تا کہ مختلف فنون کے ماہرین پیدا ہوں اور وہ اپنے متعلقہ فن میں نمایاں خدمت انجام دینے کے علاوہ ملت کے بھی کام آسکیں، ان کا واضح نقطہ نظر یہ تھا کہ تعلیم سے مقصود نفس فن کی تحصیل اور عام سطح سے اٹھ کر اس میں اختصاص پیدا کرنا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے، جب ہر فن کے مسائل منفرداً اور مستقلاً حاصل کیے جائیں اور اسی پر توجہ مرکوز کی جائے (۱۰)، دراصل یہی طریقہ تعلیم عہد وسطیٰ میں رائج اور بہت مقبول تھا جس کے تحت ہر فن یا مضمون کے استاد سے الگ الگ اس کی اختصاصی تعلیم حاصل کی جاتی تھی، یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں ہر فن کے بہت سے متخصّصین پائے جاتے تھے (۱۱)، اس کے علاوہ انہوں نے طلبہ کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لیے بحث و مباحثہ اور مناظرہ کے طریقہ کو پسند فرمایا جو قدیم دور میں ہر بڑے بڑے شہر میں منعقد ہوتا تھا، مختلف موضوعات پر جداگانہ مجلسیں منعقد ہوتی تھیں، جن میں طلبہ و علما دونوں شریک ہوتے تھے اور کسی ممتاز عالم کو بحث کے تصفیہ کے لیے حکم کے طور پر منتخب کیا جاتا تھا، علامہ شبلی کی رائے میں یہ مباحثے طلبہ کی ذہنی استعداد کو بڑھانے اور قوت استدلال کو مضبوط کرنے میں بڑے موثر اور بعض اوقات نصابی تعلیم سے زیادہ مفید ثابت ہوتے تھے (۱۲)، اس لیے جدید دور میں اس روایت کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے، مزید برآں علامہ شبلی نے درس نظامی کے جن پہلوؤں کی تحسین فرمائی ہے، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ اس میں ہر فن یا مضمون کی مشکل یا پیچیدہ کتابیں داخل نصاب ہیں اس کا ایک مفید نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ ان کو سمجھ کر پڑھنے کی وجہ سے طلبہ کی قوت مطالعہ تیز ہو جاتی ہے اور فہم کی استعداد

بڑھ جاتی ہے، پھر ان کے لیے مشکل سے مشکل کتابوں کو پڑھنا و سمجھنا آسان ہو جاتا ہے (۱۳)، گویا کہ علامہ شبلی کی نظر میں مدارس کے نصاب میں ایسی کتابوں کو شامل کرنا مفید ہوگا اور جدید دور میں بھی درس نظامی کے اس پہلو کو اختیار کرنے سے اچھے نتائج برآمد ہوں گے۔

علامہ شبلی نے جیسا کہ اوپر واضح کیا کہ قدیم و جدید دونوں اداروں کے نصاب و طرز تعلیم میں اصلاح کی ضرورت محسوس کرتے تھے، ان کا یہ خیال تھا کہ دونوں اداروں کے لوگ اپنے اپنے دائرہ میں مطمئن ہیں اور اپنے حوصلہ کے مطابق اپنے کو کامیاب سمجھتے ہیں، اس لیے نہ تو اصلاح کی طلب ہے اور نہ اس کے لیے کوشش کرتے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ عصری تقاضوں اور ملی ضروریات کے پیش نظر دونوں کی درسیات میں اصلاح اور طرز تدریس میں تبدیلی کی ضرورت ہے، دل چسپ بات یہ کہ اسی ضمن میں انہوں نے یہ چبھتا ہوا تاثر بھی ظاہر کیا کہ جدید لوگ اپنے خلاف تنقید سننے پر بہ آسانی آمدہ ہو جاتے ہیں (۱۴)، ان کی نظر میں مسلمانوں کے لیے جدید تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم بھی ضروری ہے، اس لیے کہ اس کے بغیر ان کی تعلیم مکمل نہیں ہو سکتی، رہا یہ سوال کہ یہ تعلیم کس قدر یا کس نوعیت کی ہونی چاہیے، انہوں نے اس کے جواب میں فرمایا کہ ظاہر ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں سے امامت، وعظ و افتاء جیسی مذہبی خدمات مقصود نہیں ہوتیں، اس لیے جدید تعلیم کے ساتھ اس قدر مذہبی تعلیم کا اہتمام مناسب ہوگا کہ طلبہ بہ قدر ضرورت شریعت کے مسائل اور اسلام کی تاریخ سے واقف ہو جائیں، اس کے لیے بہتر ہوگا کہ ایک مختصر و جامع سلسلۂ دینیات مرتب کیا جائے جو مرحلہ وار اسکول سے کالج تک کی کلاسز کے لائق ہو، اس کی مزید وضاحت اس طور پر فرمائی کہ انگریزی یا جدید تعلیم کے طلبہ کو عقاید، فقہ اور تاریخ اسلام کی کتابیں پڑھانے کا نظم کیا جائے اور اہم بات یہ کہ تعلیم کے مراحل کے اعتبار سے دینیات کی درسیات کی نوعیت واضح کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ اسکول کلاسوں میں صرف سادہ عقائد، فقہ اور تاریخ اسلام کی تعلیم ہو اور کالج کلاسوں میں امام غزالی، ابن رشد اور شاہ ولی اللہ کی منتخب تصنیفات خود عربی ہی زبان میں پڑھائی جائیں اور ان سب کی مجموعی ضخامت سو دو سو صفحات سے زیادہ نہ ہو (۱۵)، اس تفصیل سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ شبلی کے ذہن میں جدید تعلیمی اداروں میں دینیات کا مختصر و جامع لیکن انتہائی معیاری نصاب تھا، کالج میں دینیات کے نصاب میں امام غزالی، ابن رشد

اور شاہ ولی اللہ کی کتابوں کے اقتباسات کا شامل کیا جانا اہمیت سے خالی نہیں ہے۔

کالج کے طلبہ یا جدید تعلیم حاصل کرنے والوں کی مذہبی واخلاقی تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں علامہ شبلی کا یہ نقطہ نظر بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے لیے محض کتابی تعلیم کافی نہ ہوگی، صرف دینیات کی کتابیں پڑھانے سے ان میں مذہبی اثر پیدا ہوسکتا ہے اور نہ مذہبی امور کی پابندی ان میں آسکتی ہے، ان کی رائے میں اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ:

☆ جدید تعلیم گاہوں میں ایسا ماحول پیدا کیا جائے کہ طلبہ کے چاروں طرف مذہبی عظمت کی تصویر نظر آئے، ان میں دینی باتوں کی اہمیت جاگزیں ہوجائے اور ان میں ان باتوں پر عمل کی رغبت پیدا ہوجائے۔

☆ دینیات کے امتحان کو اہمیت دی جائے اور اس کے نتائج کو انگریزی تعلیم کے نتائج کی طرح لازمی قرار دیا جائے۔ (غالباً اس سے مراد یہ رہی ہوگی کہ آخری امتحان کے نتیجہ میں اس مضمون کے نمبرات بھی محسوب ہوں)

☆ کالج میں دینیات کی تدریس کے لیے علما (یعنی دینیات کے ماہرین) معقول مشاہرہ پر مقرر کیے جائیں۔

☆ کالج میں وعظ وتذکیر کا بھی اہتمام ہو اور وعظ کے وقت ارکانِ کالج بھی اپنی موجودگی کو یقینی بنائیں۔

☆ مذہبی امور کی پابندی کرنے والے طلبہ کی تحسین وحوصلہ افزائی کی جائے۔

☆ ان سب پر مزید یہ کہ (جسے علامہ شبلی نے سب سے مقدم کہا ہے) کالج کے سندیافتہ دو چار طلبہ کو وظیفہ دے کر ان کے لیے دینیات کی اعلا تعلیم کا اہتمام کیا جائے۔ (۱۶) (بظاہر اس سے مقصود انہیں مدارس کی تعلیم سے مستفیض ہونے کا موقع فراہم کرنا تھا)

تعلیم کے دونوں نظام (قدیم وجدید) میں اصلاح وترمیم کے لیے مفید ومناسب تجاویز پیش کرنے کے علاوہ علامہ شبلی نے اس نکتہ پر خاص زور دیا کہ مسلمانوں کو دونوں قسم کی تعلیم درکار ہے، دونوں تعلیم کے فیض یافتگان ملت کے ضروری اجزا ہیں، انہیں آپس میں دست وبازو ہوکر کام کرنا چاہیے تاکہ دونوں کی صلاحیتیں اجتماعی مفاد کے کاموں میں صرف ہوں اور دونوں اپنے

اپنے طور پر مفید خدمات انجام دے سکیں (۱۷)، علامہ شبلی کا یہ نقطہ نظر بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ دونوں طبقہ کے لوگوں کے میدان کار جدا جدا ہیں لیکن دونوں میں دوری کم کرنے اور تال میل پیدا کرنے کی سخت ضرورت ہے، اس کے لیے بہتر ہوگا کہ طلبہ کو اس طور پر تربیت دی جائے کہ وہ تعصب و تنگ نظری سے دور رہیں، ان میں اپنی برتری کا احساس غالب نہ ہونے پائے، ان کی رائے میں اس صورت حال کو بدلنے کی سخت ضرورت ہے کہ قدیم تعلیم یافتہ اور جدید تعلیم کے پروردہ ایک دوسرے کے حریف و مخالف نظر آتے ہیں یا ایک دوسرے کے لیے ایسے اجنبی معلوم ہوتے ہیں کہ ایک ساتھ رہنا و تبادلہ خیال کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ (۱۸)

ان خیالات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ شبلی قدیم و جدید تعلیم میں امتزاج پر بہت زیادہ زور دینے کے بجائے اس بات کو زیادہ اہمیت دیتے تھے کہ دونوں طبقہ کے لوگوں میں ہم آہنگی پیدا ہو اور ربط و تعاون کا ماحول قائم ہو، دونوں اپنے حدود میں رہ کر اپنی ذمہ داریاں انجام دیتے رہیں تو اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچے گا اور اختلاف و انتشار بھی کم ہو جائے گا، قدیم و جدید تعلیم حاصل کرنے والوں میں ربط و تعاون اور اجتماعی مفاد کے کاموں میں دونوں کی صلاحیتیں بروئے کار لانے سے متعلق علامہ شبلی کے یہ خیالات موجودہ دور میں بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں جب کہ ملی زندگی میں ابھرنے والے نت نئے مسائل کے پیش نظر دونوں تعلیم کے فیض یافتگان کی ضرورت بڑھتی جارہی ہے اور دونوں میں تال میل پیدا کرنے کی کوششیں بھی جاری ہیں۔

یہ بات بخوبی معروف ہے کہ علامہ شبلی کے زمانہ میں مسلمانوں میں جدید تعلیم کی اشاعت کے لیے کوششیں زوروں سے جاری تھیں، ان میں رفتہ رفتہ اس کا رواج بڑھ رہا تھا، اس باب میں سرسید تحریک کلیدی کردار ادا کر رہی تھی اور عصری تقاضوں اور ملی ضروریات کے پیش نظر جدید تعلیم کے اکتساب پر کافی زور دیا جارہا تھا، اس صورت حال میں اگر کسی گوشہ سے مشرقی تعلیم کی توسیع و ترقی یا جدید جامعات میں اس تعلیم کے اہتمام سے متعلق کوئی آواز اٹھتی یا سرکاری و غیر سرکاری سطح پر اس کے لیے کوئی پروگرام تشکیل دیا جاتا تو بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے اور اس سلسلہ میں مضامین بھی لکھتے تھے کہ اس سے جدید تعلیم کی اشاعت متاثر ہوگی، جس کی ضرورت اب بڑھ گئی ہے اور جس میں مسلمان اب دل چسپی لینے لگے ہیں، علامہ شبلی اس نقطہ نظر کو صحیح نہیں

سمجھتے تھے، ان کا یہ خیال تھا کہ مشرقی تعلیم اور جدید تعلیم کی راہیں الگ الگ ہیں، اول الذکر کی توسیع و اشاعت کے لیے کوششیں دوسری کے لیے ہرگز حارج نہ ہوں گی، دوسرے مسلمانوں نے جدید تعلیم کی اہمیت و افادیت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور وہ اس جانب راغب بھی ہو رہے ہیں لیکن ان سب کے باوجود ان کے لیے مشرقی و مذہبی تعلیم کے اہتمام کی ضرورت اپنی جگہ مسلم ہے اور یہ ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی، جدید دور میں اس کی مثالیں موجود ہیں کہ انگریزی یا جدید تعلیم کے میدان میں سرگرمیوں کے ساتھ اعلا پیمانہ پر مذہبی تعلیم کا اہتمام بھی جاری ہے، یوروپ میں جدید تعلیم کافی ترقی پر ہے لیکن ان میں ایک وسیع طبقہ ایسا موجود ہے جو مذہبی تعلیم کی نشر و اشاعت میں مصروف ہے اور اس طرح وہ مذہبی تعلیم اور مذہبی لٹریچر کے تحفظ کی خدمت انجام دے رہا ہے، خود اپنے ملک میں آریہ کی مثال موجود ہے وہ انگریزی تعلیم میں کافی ترقی پر ہیں، دوسری جانب وہ گروکل بھی قائم کر رہے ہیں، جس میں ان کے مذہب اور سنسکرت کی تعلیم اعلا پیمانہ پر جاری رہتی ہے، ان تعلیم گاہوں سے اصل مقصود ان کے مذہب و لٹریچر کی اشاعت و حفاظت ہے، سوال یہ ہے کہ کیا ان اداروں نے آریوں میں انگریزی تعلیم کو کم کر دیا ہے یا ان کی انگریزی تعلیم پر کوئی برا اثر ڈالا ہے، ان کے خیال میں اس سوال کا جواب نفی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، دراصل ان باتوں سے علامہ شبلی کا مقصود یہ گوش گزار کرنا تھا کہ مسلمانوں میں جدید تعلیم کی ترویج کی ضرورت و افادیت بالکل واضح ہو چکی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مذہبی تعلیم یا دینی اداروں کی ضرورت باقی نہیں، حقیقت یہ کہ یہ ضرورت علیٰ حالہ باقی ہے اور آیندہ بھی باقی رہے گی، ان کا واضح موقف یہ تھا کہ مسلمانوں کے لیے مشرقی و مذہبی تعلیم کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی ہے، مسلم معاشرہ کے لیے اس تعلیم کے ماہرین کی ضرورت ناگزیر ہے خواہ جدید تعلیم کی طلب کتنی ہی بڑھ جائے، مشرقی و مذہبی تعلیم کا تعلق مسلمانوں کی صرف ذاتی و انفرادی زندگی سے نہیں ہے بلکہ ان کی اجتماعی زندگی کے بہت سے مسائل بھی اس سے وابستہ ہیں، وہ بہت ہی صاف لفظوں میں فرماتے تھے:

> ''اگر یورپ کو بایں دنیاطلبی پادریوں کی حاجت ہے اور اگر آریوں کو بایں انگریزی خوانی گروکل کی ضرورت ہے تو مسلمانوں کو بھی عربی تعلیم و مذہبی

تعلیم کی ضرورت ہے اور یہ تعلیم اس وقت تک باقی رہے گی جب تک مسلمانوں کی قوم کا باقی رہنا ضروری ہے''۔(۲۰)

اس تعلیم کے ضروری ہونے کی وجہ بھی انہوں نے بیان کی کہ چاہے یہ کیسی ہی گئی گزری حالت میں ہو اس میں ایسی چیزیں شامل ہیں جو مسلمانوں کی قومیت (یعنی ملی زندگی) کی روح ہیں اور ان کے مذہب، مذہبی لٹریچر اور تہذیب وتمدن کے تحفظ واستحکام کی ضامن بھی بنتی ہیں، خود ان کے اپنے الفاظ میں:

''میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے اور میں نہایت مضبوطی سے اس پر قائم ہوں کہ مسلمان مغربی علوم میں گو ترقی کے کسی مرتبہ تک پہنچ جائے لیکن جب تک ان میں مشرقی تعلیم کا اثر نہ ہو ان کی ترقی مسلمانوں کی ترقی نہیں کہی جاسکتی، بے شبہ مشرقی تعلیم کی جو موجودہ اسکیم ہے وہ نہایت ابتر وغیر ضروری ہے لیکن اسی تعلیم میں ایسی چیزیں بھی ہیں جو مسلمانوں کی قومیت کی روح ہیں اور جس تعلیم میں اس روحانیت کا مطلق اثر نہ ہو وہ مسلمانوں کے مذہب، قومیت، تاریخ کسی چیز کو بھی زندہ نہیں رکھ سکتی''۔(۲۱)

آخر میں اس حقیقت کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ علامہ شبلی کے تعلیمی افکار کا ایک بہت ہی قیمتی پہلو یہ ہے کہ انہوں نے تعلیم کو مسلمانوں کی ملی واجتماعی ضروریات سے مربوط کیا اور یہ انقلابی فکر پیش کی کہ مسلمانوں کی تعلیم سے مطلوب صرف انفرادی زندگی کی تعمیر نہیں بلکہ مذہبی وثقافتی وملی ضروریات کی تکمیل اور بہت سے اجتماعی مسائل کا حل ان میں اعلا تعلیم کے فروغ پر منحصر ہے، ان کی نظر میں تعلیم کی ایک بہت بڑی غرض وغایت یہ ہے کہ دین کی دعوت اور اسلامی احکام وتعلیمات کی تشریح وترجمانی کے لیے افراد تیار ہوں، یعنی مسلمانوں کی تعلیم کا نظام اس طور پر مرتب کیا جائے کہ اس کے فیض سے ایسے باصلاحیت افراد پیدا ہوں جو نہایت خوش اسلوبی سے دعوت دین کا فریضہ انجام دے سکیں اور اسلام واسلامی اقدار کی موثر ترجمانی کرسکیں، ان میں ایسی اہلیت نشوونما پائے کہ وہ اسلام پر اعتراضات کا مدلل انداز میں جواب دے سکیں اور عصری تقاضوں کے مطابق صحیح ومستند مذہبی لٹریچر تیار کرسکیں، علامہ شبلی نے اپنی تحریروں میں تعلیم

کے ان مقاصد کی تکمیل پر جو زور دیا، اس کا ایک خاص پس منظر تھا، اس وقت ملک کے مختلف حصوں میں آریوں کی تحریک زوروں پر تھی، انہوں نے خاص طور سے دیہی علاقوں میں اپنے مذہبی عقاید ورسوم کی تعلیم وتبلیغ کا جال پھیلا رکھا تھا، نومسلموں میں اسلام کے بارے میں غلط فہمی پیدا کرنا اور اسلام کے خلاف ورغلانا ان کی سرگرمیوں کا نہایت اہم پہلو تھا، بقول علامہ شبلی اس تحریک کے رہنما اپنی جاں فشانی، ایثار نفسی، قناعت وخودداری سے لوگوں کو متاثر کرتے تھے، ان کے واعظین ومبلغین بڑے تعلیم یافتہ اور سادہ طرز زندگی اور فقیرانہ روش اختیار کرتے تھے، وہ گاؤں گاؤں میں پھرتے تھے، چنے چبا کر پیٹ بھر لیتے تھے اور رات کو درخت کے نیچے سو رہتے تھے (۲۲)، اپنے زمانہ کے مخصوص حالات میں وہ آریوں کے ان اوصاف سے بہت متاثر تھے اور وہ یہ برملا بیان فرماتے کہ مسلم معاشرہ میں بھی ایسے جفاکش، ایثار پسند اور مخلص علما کی ضرورت ہے جو دیہات میں پھیل جائیں اور اطراف میں اپنے مستقل تعلیمی وتبلیغی مراکز قائم کریں، اس مقصد کے تحت علامہ شبلی نے مدارس میں جن امور کے اہتمام پر خاص زور دیا وہ یہ تھے:

☆ عربی دانوں کے لیے انگریزی وسنسکرت زبان کی اعلا تعلیم کا اہتمام۔

☆ مدارس میں مبلغین ودعاۃ کی تربیت کے لیے شعبہ اشاعت وحفاظت اسلام قائم کرنا۔

☆ مختلف اضلاع میں اس شعبہ کی شاخیں قائم کر کے مستقل واعظین مقرر کرنا تاکہ وہ دیہاتوں میں ایک ایک دو دو مہینہ رہ کر اسلامی عقاید واحکام کی تعلیم دیں اور خاص طور سے نومسلموں میں وہ دعوت وتربیت کا کام کریں۔

☆ مستقل واعظین ومبلغین کا نظم نہ ہونے تک اس کا ایک عارضی متبادل نظم قائم کیا جائے اور اس کے لیے ائمہ وموذنین کو تربیت دی جائے، ان کے لیے اردو کا برس دو برس کا کورس بنایا جائے اور اردو پڑھنے والے نوجوانوں کو قرآن پاک کے ساتھ اردو میں مسائل وعقاید کی سادہ تعلیم دے کر دیہاتوں کی مسجدوں میں پھیلا دیا جائے، یہ مسجدوں میں بچوں کو تعلیم بہم پہنچائیں اور لوگوں میں اسلام کی تبلیغ بھی کرتے رہیں۔ (۲۳)

علامہ شبلی صرف گفتار کے نہیں بلکہ کردار کے بھی غازی تھے، انہوں نے ندوۃ العلما میں اپنی تجاویز کو ابتدائی شکل میں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی اور صیغۂ اشاعت وحفاظت اسلام کے

نام سے ۱۹۰۸ء میں ایک علاحدہ شعبہ قائم کیا، اس کے سکریٹری مولانا شاہ سلیمان پھلواری مقرر ہوئے لیکن بعض وجوہ سے اس شعبہ کا کام آگے نہیں بڑھ سکا (۲۴)، پھر انہوں نے اسی مقصد سے ندوہ سے باہر ایک مجلس اشاعت وحفاظت اسلام قائم کی اور سید سلیمان ندوی کو شریک ناظم کے طور پر مقرر کیا، انہوں نے اس کی سرگرمیوں کو کافی آگے بڑھایا، جس میں نومسلموں کی مردم شماری، ان کے احوال وکوائف کے باب میں معلومات کی فراہمی، ان کی آبادیوں میں احکام اسلام کی ترویج واشاعت کا اہتمام اور مضامین، خطوط، اشتہارات و پمفلٹ کے ذریعہ مسلمانوں میں ان کے مسائل کے تئیں بیداری پیدا کرنا اور ان تمام کاموں کے لیے اہل علم واصحاب خیر سے تعاون کی دردمندانہ اپیل کرنا شامل ہیں، یہ تمام کام علامہ شبلی کی نگرانی وہدایت میں انجام پاتے رہے (۲۵)، ان سب سے مقصود یہ تھا کہ ایک ایسا مرکز وجود میں آئے جہاں ایسے داعیان دین تیار ہوں جو مذہبی ومشرقی تعلیم کے ساتھ علاقائی زبانوں اور عصری مضامین سے بخوبی واقف ہوں تاکہ اسلام کی اشاعت اور علمی سطح پر آریہ مبلغین سے مقابلہ کے لیے وہ مفید وکارگر ثابت ہوں، ان کے پیش نظر یہ بھی تھا کہ اس مرکز کے زیر اہتمام دیہات وقصبات کی بالخصوص نومسلم آبادی میں احکام اسلام کی ترویج کا اہتمام کیا جائے۔

دین کی دعوت اور اسلام کے دفاع کے لیے باصلاحیت افراد تیار کرنے سے متعلق ان تجاویز واقدامات سے قطع نظر علامہ شبلی مبلغینِ اسلام (جنہیں وہ خدام الدین کہتے تھے) کی تربیت کے پورے نظام کو مدارس سے منسلک کرنے کے حق میں تھے، درحقیقت وہ خدام الدین کی تربیت کو مدارس کے نظام کا ضروری جز بنانا چاہتے تھے اور اس مقصد سے ان کی درسیات اور طریقہ تدریس میں مناسب ترمیم واضافہ بھی چاہتے تھے، مدارس میں عربی وفارسی اور اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی وسنسکرت کی تعلیم پر زور دینے کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ ان اداروں کے طلبہ مختلف پہلو سے دین کی خدمت اور اسلام کی تبلیغ وترجمانی کے لیے تیار ہوجائیں، آریوں سے مقابلہ کے لیے اور ان کی تحریک کے خطرات کے ازالہ کے لیے علامہ شبلی کے ذہن میں مبلغین کی ایسی جماعت کا نقشہ تھا جو محنتی وجفاکش ہو، ایثار وقناعت جیسے اوصاف سے متصف ہو اور سادہ مذہبی زندگی میں رچی بسی ہو، اس باب میں وہ اس خیال کے حامل تھے کہ دیہات کے

کسی مدرسہ کو خدام الدین کی تربیت کا مرکز بنایا جائے تو زیادہ بہتر و مفید رہے گا (۲۶)، یہاں یہ واضح رہے کہ علامہ شبلی نے خدام الدین کی تیاری کے لیے سادگی، ایثار و قناعت اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے بار بار گروکل کے تربیت یافتہ آریہ مبلغین سے سبق حاصل کرنے پر زور دیا ہے، اس پر مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم کا تبصرہ بہت مناسب معلوم ہوتا ہے، خود ان کے الفاظ میں ملاحظہ کریں:

> ''ہندوستان کے مخصوص حالات میں مولانا پر اس وقت گروکل کا تصور چھایا ہوا تھا ورنہ رسول اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ سے بڑھ کر کس کی زندگی میں ایثار و سادگی اور قناعت کا نمونہ ملے گا''۔ (۲۷)

خدام الدین کی تیاری کے لیے ان کی نظر سب سے پہلے مدرسۃ الاصلاح پر پڑی جو اس وقت مجلس اصلاح المسلمین سے مدرسہ کی صورت میں منتقل ہو کر مولانا حمید الدین فراہی کی سرپرستی میں مولانا محمد شفیع کے زیر نظامت ترقی کے منازل طے کر رہا تھا، یہ مدرسہ سرائے میر (اعظم گڈھ) کے قریب ایک دیہی علاقہ میں تھا اور اپنی سادگی و اصول پسندی کے لیے معروف تھا، انہوں نے اپریل ۱۹۱۰ء میں مولانا فراہی کے نام ایک خط میں یہ تجویز رکھی کہ اس مدرسہ کو ''گروکل'' کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہیے، یعنی سادہ زندگی اور قناعت و مذہبی خدمت مطمح زندگی ہو، مولانا فراہی کے نام علامہ شبلی کے خط کا یہ حصہ بہت ہی مشہور ہے اور اکثر اس کا حوالہ دیا جاتا ہے:

> ''کیا تم چند روز سرائے میر کے مدرسہ میں قیام کر سکتے ہو اور میں بھی شاید آؤں اور اس کا نظم و نسق درست کر دیا جائے، اس کو گروکل کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنایا چاہیے یعنی سادہ زندگی اور قناعت اور مذہبی خدمت مطمح زندگی ہو''۔ (۲۸)

یہ قطعی طور پر معلوم نہیں کہ مولانا فراہی نے اس کا کیا جواب دیا لیکن یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ ان دنوں علامہ شبلی خدام الدین کی جماعت کے قیام کے تئیں بہت سنجیدہ و سرگرم تھے اور وہ جلد از جلد کسی مدرسہ میں اس کی داغ بیل ڈالنا چاہتے تھے، چنانچہ ندوۃ العلما میں انہوں

نے اس کی بنیاد ڈال دی، کچھ طلبہ اس کام کے لیے تیار ہوگئے، ان کو باقاعدہ اس جماعت میں داخل کرنے سے قبل ان کے والدین کی رضامندی بھی حاصل کی، ان طلبہ کے لیے روزمرہ زندگی کا یہ اصول وضع کیا گیا کہ وہ کھانے پینے اور رہن سہن میں سادگی اختیار کریں گے، زمین پر سوئیں گے اور احکام اسلامی کی پوری پابندی کے ساتھ تقویٰ وقناعت کی زندگی کو اپنا شعار بنائیں گے (۲۹)، خدام الدین کی تربیت کا یہ سلسلہ جنوری ۱۹۱۲ء کے شروع میں قائم ہوا، اس کے تقریباً ایک ماہ بعد مولانا فراہی کے نام خط میں اس جماعت کے قیام پر اظہار مسرت کرتے ہوئے مختصراً اس کی کارکردگی بیان فرمائی اور یہ امید ظاہر کی کہ تربیت کے بعد یہ طلبہ دیہات میں اشاعت اسلام کے لیے کارگر ثابت ہوں گے (۳۰)، ۱۹۱۳ء میں ندوہ سے علامہ شبلی کی علاحدگی کے بعد ظاہر ہے کہ خدام الدین کی تربیت کا یہ سلسلہ منقطع ہوگیا لیکن اس کی ضرورت وافادیت ان کے ذہن میں اس قدر رچ بس گئی تھی کہ وہ اس سے غافل نہ رہے، ندوہ کی ذمہ داری سے سبک دوشی کے بعد جب انہوں نے اعظم گڈھ کو اپنی مصروفیات کا مرکز بنایا تو پھر ان کے ذہن میں یہ خیال تازہ ہوا کہ مدرسۃ الاصلاح میں خدام الدین کی تربیت کا اہتمام کیا جائے اور اس مدرسہ کے نظام کو اس نہج پر ڈھالا جائے کہ یہ ایسے باصلاحیت داعیانِ دین کی تیاری کا مرکز بن جائے جو بہتر وموثر انداز میں اسلامی اقدار وتعلیمات کی تشریح وترجمانی کی خدمت انجام دے سکیں اور اسلام مخالف سرگرمیوں کا تدارک کرسکیں، ۲۳/ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو مولانا فراہی کے نام ان کے تحریر کردہ خط سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ وہ یہ چاہتے تھے کہ سرائے میر (مدرسۃ الاصلاح) یا اعظم گڈھ (دارالمصنّفین) کسی ایک کو ایسا مرکز بنایا جائے کہ اس میں دینی ودنیوی دونوں اعتبار سے اعلا تعلیم کا اہتمام ہو، خدام الدین کی تربیت کا باقاعدہ نظم ہو اور ایک معقول کتب خانہ بھی قائم ہو (۳۱)، بعد میں اکتوبر ۱۹۱۴ء میں مولانا مسعود علی ندوی کے نام ان کے تحریر کردہ خط سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ مدرسۃ الاصلاح کو ابتدائی تعلیم کا مرکز اور دارالمصنّفین کو درجہ تکمیل بنانا چاہتے تھے، اس طرح ایک پوری جامعہ اسلامیہ یا یونی ورسٹی سطح کی اعلا تعلیم کا نقشہ ان کے ذہن میں تھا، جیسا کہ ان کے ان الفاظ سے مترشح ہوتا ہے:

''دارالمصنّفین درجہ تکمیل، سرائے میر کا درجہ ابتدائی، پورا جامعہ اسلامیہ

کا مصالحہ ہے، کام کرنے کی ضرورت ہے''۔(۳۲)

مسلمانوں کی تعلیم، مدارس کے نظام تعلیم وتربیت اور تعلیم کو بامقصد بنانے سے متعلق علامہ شبلی کی ان تجاویز کی اہمیت وافادیت سے کون انکار کرسکتا ہے لیکن ان کی آخرالذکر تجویز (خدام الدین کی تیاری کو مدارس کے نظام تعلیم وتربیت کا ضروری جز بنایا جائے) ابھی منصوبہ بندی یا عمل آوری کے ابتدائی مرحلہ میں تھے کہ وہ ۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء کو اس دارفانی سے رخصت ہوگئے (اللھم اغفر وارحم وانت خیر الراحمین) اوران کے اپنے بنائے ہوئے نقشہ کے مطابق یہ کام آگے نہ بڑھ سکا۔

اوپر کی تفصیلات سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ علامہ شبلی تعلیم کا بہت ہی جامع تصور رکھتے تھے، ان کی نظر میں تعلیم نہ صرف یہ کہ ہر شخص کی انفرادی زندگی کی تعمیر وترقی کا بہترین وسیلہ ہے بلکہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی بہت سی ضروریات اس سے وابستہ ہیں، اس لیے وہ مسلمانوں کے لیے مختلف علوم وفنون کے اکتساب کو ضروری سمجھتے تھے اوران کے لیے تعلیمی نظام کی تشکیل میں عصری تقاضوں کی رعایت کو کافی اہمیت دیتے تھے، ان سب کے علاوہ مذکورہ مباحث سے ان کے تعلیمی افکار کا ایک بہت اہم پہلو یہ سامنے آتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے مخصوص حالات اور غیر مسلم مبلغین کی ریشہ دوانیوں کے پیش نظر مسلمانوں کے تعلیمی نظام بالخصوص مدارس کے تعلیمی سلسلہ کو ایک عظیم مقصد سے مرتبط کرنا چاہتے تھے اور وہ تھا اسلام کی تبلیغ واشاعت، اسلامی احکام وتعلیمات کی بہتر تشریح وترجمانی اور اسلام مخالف عناصر سے مقابلہ (یا فی الجملہ دین کی خدمت) کے لیے باصلاحیت مخلص، محنتی وجفاکش افراد تیار کرنا، اس میں کوئی دورائے نہیں کہ وہ مدارس کو ان افراد کی تعلیم وتربیت کا بہترین مرکز سمجھتے تھے اوراس نقطۂ نظر سے ان کے تعلیم و تربیت کے نظام میں اصلاح وترقی کی جانب اہل مدارس کو بار بار متوجہ کرتے رہے، بلاشبہ برصغیر کے موجودہ حالات اور ملت اسلامیہ کو درپیش مسائل کے سیاق میں علامہ شبلی کے یہ افکار بڑی اہمیت ومعنویت رکھتے ہیں، اس لیے کہ موجودہ صورت حال میں مسلم معاشرہ کو مختلف علوم وفنون خاص طور سے اسلامی وعصری علوم کے ماہرین کی ضرورت اور زیادہ بڑھ گئی ہے، اسلام واسلامی نظام حیات پر نئے نئے اعتراضات وشبہات سامنے آرہے ہیں، قرآن کریم، پیغمبر آخرالزماں ؐ اور

شریعت اسلامیہ کے خلاف پروپیگنڈہ کی مہم تیز سے تیز تر ہوتی جارہی ہے اور اس کام میں ''الکفر ملۃ واحدۃ'' کے اصول پر تمام مخالف قوتیں مجتمع اور انتہائی سرگرم ہوگئی ہیں، ایسے سنگین حالات میں اسلام کے دفاع اور دین کی خدمت میں منہمک ہوجانے والوں کی ضرورت کس قدر بڑھ گئی ہے وضاحت کی محتاج نہیں، واقعہ یہ کہ علامہ شبلی نے اپنے زمانہ کی صورت حال میں اس بات پر خاص زور دیا کہ مسلمانوں کے لیے نہ صرف مشرقی تعلیم کافی ہے اور نہ محض جدید تعلیم سے آراستہ ہونا ان کی انفرادی و اجتماعی ضروریات کی کفایت کرسکتا ہے بلکہ ان کے لیے ایک ایسا تعلیمی نظام درکار ہے جو مرکب ہو مشرقی و عصری تعلیم سے (۳۳)، مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم نے علامہ شبلی کے اس نقطہ نظر پر تبصرہ کرتے ہوئے بجا فرمایا ہے:

> ''دراصل وہ دین و دنیا کی خلیج پاٹنا اور قدیم و جدید کا ڈانڈا ملانا چاہتے تھے، کیوں کہ ان کے نزدیک موجودہ دور میں نہ محض قدیم تعلیم سے مسلمانوں کے مسائل اور ضرورتوں کا حل ممکن ہے اور نہ صرف جدید تعلیم ہی ان کے دکھ اور درد کی دوا ہے، دونوں کے مجموعے اور آمیزش ہی میں ان کے مسائل اور پریشانیوں کا علاج ہے''۔ (۳۴)

مختصر یہ کہ آج کے حالات میں علامہ شبلی کے تعلیمی افکار و نظریات اور زیادہ برمحل و بامعنی معلوم ہوتے ہیں، اس لیے کہ مسلمانوں کے اجتماعی و ملی مسائل کے حل کے لیے دینی و عصری تعلیم میں امتزاج اور دونوں تعلیم کے فیض یافتگان میں تال میل اور ربط و تعاون کی ضرورت اب پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہے اور دوسری جانب اس امتزاج اور ربط و تعاون کا مسئلہ مزید پیچیدہ ہوتا جارہا ہے، اہم بات یہ کہ علامہ شبلی نے نہ صرف یہ کہ اس مسئلہ کی جانب توجہ دلائی بلکہ وقت کے تقاضے کے مطابق اس کے حل کے لیے تجاویز بھی پیش کیں، اس کے علاوہ یہ بات بھی کچھ کم اہم نہیں کہ انہوں نے مدارس کی تعلیم کو اس طور پر مرتب و منظّم کرنے پر زور دیا کہ ان اداروں سے ایسے باصلاحیت افراد پیدا ہوں جو اسلام کی اشاعت، دین کی دعوت اور اسلامی احکام و تعلیمات کی تشریح و ترجمانی کی خدمت بہتر طور پر انجام دے سکیں، اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ برصغیر بلکہ پوری دنیا کے حالات کا تقاضا یہی ہے کہ مسلمانوں میں باصلاحیت، مخلص و محنتی خدام الدین زیادہ

سے زیادہ تعداد میں پیدا ہوں اور بلاشبہ علامہ شبلی کا یہ تاثر بجا ہے کہ دینی مدارس ہی اس طرح کے افراد کی تیاری کے بہترین مرکز ثابت ہو سکتے ہیں۔

حواشی ومراجع

(۱) ضیاءالدین اصلاحی، مسلمانوں کی تعلیم، دارالمصنّفین، اعظم گڈھ، ۲۰۰۷ء (باب ۹: مولانا شبلی کے تعلیمی افکار و نظریات)، ص ۱۳۰۔ (۲) مقالات شبلی (مرتبہ سید سلیمان ندوی)، مطبع معارف، اعظم گڈھ، ۱۹۵۵ء، (مقالہ: تعلیم قدیم وجدید) ۳/ ۱۳۹-۱۴۰۔ (۳) مقالات شبلی، ۳/ ۱۴۰۔ (۴) مقالات شبلی، ۳/ ۱۴۰۔ (۵) مقالات شبلی، ۳/ ۱۴۲۔ (۶) سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، دارالمصنّفین، اعظم گڈھ، ۲۰۰۶ء، ص ۲۰- ۲۱۔ (۷) حیات شبلی، ص ۱۳۵۔ (۸) مقالات شبلی، ۳/ ۱۴۲- ۱۴۳۔ (۹) مسلمانوں کی تعلیم، محولہ بالا، ص ۱۵۳۔ (۱۰) مقالات شبلی، ۳/ ۱۲۹۔ (۱۱) ملاحظہ فرمائیں: ظفرالاسلام اصلاحی، تعلیم عہد اسلامی کے ہندوستان میں، دارالمصنّفین، اعظم گڈھ، ۲۰۰۷ء، (باب دوم: عہد اسلامی کے ہندوستان میں اعلا تعلیم کے ذرائع)، ص ۴۴-۴۷۔ (۱۲) مقالات شبلی، ۳/ ۸۲۔ (۱۳) ایضاً، ۳/ ۹۹- ۱۰۰۔ (۱۴) مقالات شبلی، ۳/ ۱۴۰۔ (۱۵) مقالات شبلی، ۳/ ۱۴۱۔ (۱۶) مقالات شبلی، ۳/ ۱۴۱- ۱۴۲۔ (۱۷) مقالات شبلی، ۳/ ۱۴۳۔ (۱۸) مقالات شبلی، ۳/ ۱۴۳۔ (۱۹) مقالات شبلی، ۳/ ۱۴۶- ۱۴۷۔ (۲۰) مقالات شبلی، ۳/ ۱۴۸۔ (۲۱) شبلی نعمانی، سفرنامہ روم ومصر وشام، مطبع معارف، اعظم گڈھ، ۱۹۴۰ء، ص ۱۸۶- ۱۸۷۔ (۲۲) حیات شبلی، ص ۵۶۱- ۵۶۲۔ (۲۳) حیات شبلی، ص ۵۶۲- ۵۶۴، مسلمانوں کی تعلیم، ص ۱۵۵- ۱۵۷۔ (۲۴) حیات شبلی، ص ۵۵۷-۵۵۸۔ (۲۵) حیات شبلی، ص ۵۶۵-۵۷۵۔ (۲۶) مسلمانوں کی تعلیم، ص ۱۵۷-۱۵۸۔ (۲۷) حوالہ مذکور، ص ۱۶۰۔ (۲۸) مکاتیب شبلی (مرتبہ سید سلیمان ندوی) دارالمصنّفین، اعظم گڈھ، ۱۹۷۱ء، ۲/ ۲۳ (مکتوب نمبر ۵۰)۔ (۲۹) حیات شبلی، ص ۵۷۶۔ (۳۰) مکاتیب شبلی، ۲/ ۳۶ (مکتوب نمبر ۵۵)۔ (۳۱) مکاتیب شبلی، ۲/ ۴۶- ۴۷ (مکتوب نمبر ۶۸)۔ (۳۲) مکاتیب شبلی، ۲/ ۱۳۵ (مکتوب نمبر ۲۵)۔ (۳۳) مقالات شبلی، ۳/ ۱۶۳۔ (۳۴) مسلمانوں کی تعلیم، ص ۱۸۰۔

ولی دکنی کی فارسی شاعری

جناب شاہد نوخیز صاحب

یوں تو مبدأ فیاض نے تمام کائنات کو ایک ہی جوہر سے تخلیق کیا ہے لیکن مختلف خطوں نے اپنی استطاعت اور زرخیزی کی بنا پر جدا جدا رونق و رعنائی حاصل کی اور ایک دوسرے سے برتر و ممتاز ہوئے۔

سرزمین دکن کی بلند اقبالی کا ستارہ اس وقت اوج کمال پر پہنچا جب سلطان محمد تغلق جیسے عالم، مدبر اور صاحب فراست بادشاہ کی نظر انتخاب اپنی وسیع و عریض سلطنت کے موزوں تر دارالخلافہ کی حیثیت سے شہر دولت آباد پر پڑی، پایہ تخت کی دہلی سے دولت آباد منتقلی کے تاریخ ساز فیصلہ نے سطح مرتفع دکن کی قسمت ہی بدل دی اور دکن میں تہذیب و تمدن، علم و ادب، روایات و رجحانات کا ایک نیا باب شروع ہوا، دہلی سے مملکتی امور کے عہدہ داروں اور امیرانِ صدہ کے ساتھ ساتھ صوفیائے کرام اور اولیاء اللہ نے بھی جنوب کی سمت ہجرت کی اور دکن کو اپنا مستقر بنالیا، یہاں مقامی اثرات کو قبول کرتے ہوئے ایک مخلوط لیکن منفرد تہذیب پروان چڑھنے لگی جو آگے چل کر ''دکنی تہذیب'' کے نام سے مشہور ہوئی۔

فارسی، سلاطین دہلی کی سرکاری اور درباری زبان ہی نہیں تھی بلکہ علمی اور ادبی زبان کا بھی درجہ رکھتی تھی بول چال کی سطح پر شمالی ہند میں کھڑی بولی اور برج بھاشا کے اختلاط سے فارسی نے ایک ملی جلی بولی کو جنم دیا تھا، جس کا ابھی تک کوئی خاص نہج یا اسلوب نہیں بن پایا تھا، دکن کا رخ کرنے والوں نے اپنے ہمراہ شمالی ہند کی اس خام بولی کی روایت کو بھی دیگر تہذیبی و ثقافتی روایات کے ساتھ ساتھ دکن پہنچایا اور یہاں اسے فروغ دیا، مقامی زبانوں سے بھی اثر پذیری جاری

شعبہ فارسی، مولانا ابوالکلام آزاد یونی ورسٹی، حیدرآباد۔

رہی، دکن کے امیرانِ صدہ کی مسلسل سیاسی بغاوتوں اور جدوجہد کے بعد جب حسن بہمن شاہ نے ۱۳۴۷ء میں سلطنت بہمنیہ کی بنیاد رکھی تو یہ سلطنت دربار دہلی کے تہذیبی ورثہ کی بھی امین بن گئی، فارسی زبان ان کی بھی سرکاری اور ثقافتی زبان تھی، جس کی وجہ سے فارسی شعروادب کا رواج دکن میں عام ہوگیا، اولیا، صوفیہ، علما، ادبا وفضلا نے اپنی علمی وادبی سرگرمیوں سے اس خطۂ زمین کو فارسی ادبیات کا گہوارہ بنادیا۔

بہمنی سلطنت مختلف لسانی علاقوں پر مشتمل تھی جہاں تلنگی، مرہٹی اور کناڈا زبانیں زمانہ قدیم سے رائج تھیں، اس صورت حال میں فارسی کے علاوہ شمالی ہند کی مخلوط بولی نے بھی ان تینوں زبانوں پر بڑے اہم اثرات مرتب کیے اور ساتھ ہی ساتھ ان سے اثر بھی قبول کرتی اور فروغ پاتی رہی، چونکہ اس نئے ماحول اور متنوع عوامل کے حامل علاقے میں نشوونما کے وافر مواقع مہیا تھے، اس لیے اس بولی نے بہت جلد ایک ادبی زبان کی حیثیت اختیار کرلی، جسے ''دکنی اردو'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، چنانچہ بہمنی عہد کے ابتدائی زمانے سے ہی دکن کے ادبی آثار دست یاب ہوتے ہیں۔

تاہم فارسی، حکمرانوں کی زبان تھی اور اس کی علمی وشعری روایت اتنی پختہ تھی کہ دکنی کا عروج بھی فارسی کے خورشید کو گہنا نہ سکا، اس طرح بہمنی اور اس کی وارث عادل شاہی، قطب شاہی، برید شاہی، نظام شاہی اور عماد شاہی سلطنتوں کی سرپرستی میں فارسی شعروادب کا ایک بیش بہا ذخیرہ تیار ہوگیا۔

فارسی کی اتباع میں دکنی ادب میں بھی مختلف اصناف سخن متعارف ہوئے، مثنوی، غزل، قصیدہ، رباعی اور مرثیہ دکنی ادب کے مستقل اور مقبول اصناف بن گئے اور نظامی، غواصی، نصرتی، وجہی، سلطان قطب شاہ، سلطان علی عادل شاہ جیسے باکمال شعرا کو دکنی اردو کے معمار کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

سترہویں صدی عیسوی میں ولی کے زمانے تک دکنی تہذیب اور ادب کی پاسدار سلطنتیں مغلیہ حکمرانوں کے ہاتھوں شکست کھاچکی تھیں، دکنی کلچر کا شیرازہ بھی بکھر چکا تھا، لیکن فارسی روایت کا چراغ گل نہ ہوسکا، جس کے زیر اثر ولی نے اپنے دکنی کلام میں بھی فارسی تراکیب، استعاروں

اورادبی اسلوب کواپنایااور برتا ہے، ولی کے اس اجتہاد سے دکنی یا اردوشاعری کے ایک اہم دور کا آغاز ہوتا ہےاوراسی بناپر ولی دکنی کواردوشاعری کا باوا آدم تسلیم کیا جاتا ہے۔

ولی نے دیگر پیش رو دکنی شعرا کی تقلید میں دکنی کے ساتھ ساتھ فارسی زبان میں بھی طبع آزمائی کی جس کی یادگار اس کے فارسی کلام کا دیوان ہے، دکنی کلام کی روشنی میں ولی کی شخصیت کی ہمہ گیری اور گونا گونی مسلم ہے لیکن اس کے فارسی دیوان کی دریافت نے سخن پارس کے اس کے ایک منفرد پہلو سے روشناس کرایا ہے۔

ولی کی فارسی شاعری تصوف اور رموز معرفت کا بحر ذخار ہے، وہ علامات و کنایات کے ساتھ ساتھ تصورات، تلمیحات اور اصطلاحات کے ذریعہ اپنی بات اور حکمت کو بیان کرتا ہے، اس کے اشعار میں واقعیت ہے، اس نے اپنی فارسی غزلیات میں تصوف کے ہر تصور اور فکر کو بخوبی باندھا ہے کیونکہ تصوف اس کا ذاتی تجربہ ہے، یہی اس کی زندگی ہے اور مقصد زندگی بھی، تصوف وعرفان کی روایت فارسی شعر وادب میں بہت قدیم اور پختہ رہی ہے اور اساتذۂ فارسی کے کلام کا ایک بڑا ذخیرہ ولی کے پیش نظر تھا، ادب اور اسلوب کے معیار اور طرز ادا کے مسلم اور مستند پیمانے اس کی رہنمائی کے لیے موجود تھے، موضوع کے انتخاب اور طریقہ اظہار سے متعلق بھی اسے کچھ خاص جد و جہد کرنی نہیں پڑی، طبع موزوں تھی ہی تصوف کے خیالات بہت عام تھے، جس کے سبب ولی نے صوفیانہ طرز ادا کو اپنا موضوع سخن بنالیا، ولی کا یہ رنگ نہ صرف دکنی اردو کی شاعری میں غالب نظر آتا ہے بلکہ اس کا فارسی کلام سراپا تصوف ہے۔

تصوف اس وقت فکری اور اخلاقی بلندی کا معیار بھی تھا، عشق اور وحدت الوجود اس دور کے ترجمان رجحانات تھے، سماج کا ہر اصول اخلاق صوفیانہ رنگ میں رچا بسا تھا، تمام لیاقتیں، بلند خیالیاں، علم وفن اور فکر کی جولانیاں، سب تصوف کی ڈور سے بندھی تھیں، سماج کا ہر طبقہ وحدت الوجود کے عقیدہ سے متاثر تھا جس کے مطابق صرف ذات باری ہی کا وجود حقیقی سمجھا جاتا اور ماسوا تمام کے وجود باطل وفانی قرار پاتے ہیں، اس ایک نظریہ کے اثر سے اس دنیا کی بے ثباتی، زندگی کی بے اعتباری، علائق دنیوی سے کنارہ کشی، معشوق حقیقی کی جلوہ گری، قرب الٰہی کی خواہش، سوز فراق، عشق کی سرمستی اور سرور و محویت جیسے جذبات واحساسات نہ صرف مذہب و

اخلاق بلکہ شعروادب میں بھی سما گئے تھے۔

ولی کے ہاں شاعری ان تمام تجربات دروں کا اظہار ہے اور اس وارداتِ قلبی کے بیان میں بڑی تاثیر ہے، انہوں نے حسن و عشق کے معاملات میں بھی رقت انگیزی، سوز و گداز اور شدت جذبات کے ساتھ اپنے مخصوص صوفیانہ رنگ کو بڑے ہی محکم اور منفرد انداز میں نبھایا ہے، ان کی غزلوں میں عشق کی سرشاری بھی ہے اور والہانہ پن بھی، ہجر کی تڑپ بھی ہے اور خواہش وصال بھی، احساس و جذبہ کی شدت بھی ہے اور کیفیات قلبی کا اظہار بھی، اس کا محبوب خدا بھی ہے اور جلوۂ خدا بھی۔

وحدت الوجود کے فلسفہ کو ولی نے حکیمانہ انداز میں بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے، اپنے اشعار میں وہ ایک ایسے عاشق کے روپ میں نظر آتا ہے جو جام وحدت کی سرمستی سے عالم محویت میں دنیا کو دیکھ رہا ہے جس کے آگے محبوب حقیقی کے کرشمے جلوہ افروز ہیں اور ذرہ ذرہ میں اسی کا عکس ہے، اس کی شاعری عشق کا ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں ساری کائنات ایک وحدت بن گئی ہے۔

عین او یافتہ ام اشیاء را پردۂ شرک دریدم بابا

تمام اشیا اور مظاہر کو میں نے کاملاً اس ذات حقیقی کی مانند پایا ہے، اس طرح شرک کے پردے چاک کر کے میں نے توحید حق تک رسائی حاصل کی ہے۔

پنہائی او باعثِ پیدای اشیا است بحری کہ باامواج نہاں گشت عیانست

ذات باری کے پوشیدہ ہونے کے سبب تخلیق کا اظہار ہوا جیسے کہ سمندر پر موجیں ظاہر ہوتی ہیں اور سمندر ان موجوں میں چھپ جاتا ہے، پھر بھی موجود رہتا ہے۔

چو توحید آمد اضافات رفت بہ تسبیح و زنار دیگر دغا است

جب سالک کو وحدت حقیقی کا ادراک ہو جاتا ہے تو تمام اضافی عناصر اور عوامل باطل قرار پاتے ہیں، اب تسبیح یا زنار کا کوئی کام نہیں، راہ سلوک میں تمام ظاہری اصول وضوابط پیچھے چھوٹ جاتے ہیں۔

در ظاہر و باطن ہمہ آنست کہ دانی در اول و آخر ہمہ آنست چنانست

اس کائنات کے ظاہر اور باطن میں ہر ذرہ میں اسی کی ذات جلوہ نما ہے، اس کی ذات قدیم ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ اسی طرح باقی رہے گی۔

مسلکِ تصوف پر گام زن رہنے کے سبب ولی نے تزکیۂ نفس، فقر و درویشی، بے ثباتیِ

دہر اور فنا و موت جیسے صوفیانہ تصورات کو اپنی بیشتر فارسی غزلیات میں بیان کیا ہے اور یہ وہی موضوع اور لب ولہجہ ہے جو دکن کے پورے ماحول میں چھایا ہوا تھا، تصوف میں عزلت نشینی، سیر باطنی، محاسبۂ خودی، تصفیۂ قلب اور فاقہ کشی عشق کی منزل یعنی قرب الٰہی تک رسائی کے لیے تربیتی مراحل کا درجہ رکھتے ہیں اور ہر ایک مرحلہ بہت ہی اہم اور ناگزیر مانا جاتا ہے، ولی نے ان مراحل کے بیان میں حکیمانہ اور ناصحانہ اسلوب کو اپنایا ہے، ملاحظہ کیجیے:

خلوت نشینِ دل شو، در دل بدل چو دل شو درخویش مضمحل شو، در یاب سرِ فقراء

اپنی ذات میں خلوت نشین ہو جا، یکسو ہو کر اپنے باطن کو پہچان اور رقتِ قلب اور آہ وزاری سے اپنے نفس کا تزکیہ کر، اسے توانا ہونے نہ دے، تب ہی تو درویشوں کے اسرار ورموز کو پا سکے گا۔

ای ولی راہِ ھذا چوں جز فنا وفقر نیست بی تکلف پس فدا شو در رہِ فقر و فنا

اے ولی جب یہ راہِ سلوک فقر و درویشی اور بالآخر ذات حق میں خود کو فنا کر دینے کے سوا کچھ نہیں، پس تو بے دریغ اسی فقر وفنا کے راستے پر اپنی ذات کو قربان کر دے۔

تن پروری چہ داند، حیوانِ وقت ماند گو اہل دل کہ خواند در خود کتابش خود را

راہِ سلوک کی سختیوں یا درویشی کے تجربوں سے ایک تن پرور بندہ واقف نہیں ہو سکتا، وہ تو ایک حیوان کی مانند اپنے نفس کو پالتا رہتا ہے، اسے کچھ علم نہیں ہو سکتا کہ اہل دل اپنی ذات کی کتاب پر کیا کیا تحریریں پڑھ رہے ہیں اور اپنے باطن کے افق پر کون سے نقش ہائے رنگا رنگ کا نظارہ کر رہے ہیں۔

گنجی کہ بود مخفی اکنوں شد آشکارا زیں گنج کیسے پر کن، ایں مژدہ گو گدا را

وہ کنز مخفی اب آشکارا ہو گیا ہے، سالک اور درویش کو یہ خوش خبری دے دی جائے کہ وہ اپنے کیسۂ فقیری کو اس خزانے سے معمور کر لیں۔

دنیا کی بے ثباتی اور دنیوی شان وشوکت کی بے مایگی کو ولی اس طرح ظاہر کرتا ہے:

کرّ خانخانانی بود، یا تخت سلطانی بود جز حق ہمہ فانی بود، برخود مبیں، درخود بہ بیں

خانخاناں کا جاہ وجلال ہو یا شاہی تخت وتاج کا شکوہ وکمال، سب فانی ہیں، سوائے ذات حق کے، پس تو اپنی ظاہری حالت پر نہ جا، تو شاہ ہے یا گدا، اس پر نظر مت کر کیونکہ یہ کیفیتیں تمام باطل ہیں تو اپنے اندر جھانک اور اپنے نفس کی حالت کا جائزہ لے اور اسے درست کرنے میں جٹ جا، تا کہ حقیقی منزل کو پا سکے۔

غافل ز عقبی و از مولا بعید   مانده در بند دنیای عبث

اپنی آخرت سے غافل ہوکر اپنے رب سے دور اس فانی دنیا کی محبت میں کب تک اسی طرح گرفتار رہے گا۔

''من عرف نفسه ، فقد عرف ربه'' کے مطابق خودشناسی کو راہ سلوک میں خدا شناسی کی سیڑھی مانا جاتا ہے، ولی خودآشنائی کی تلقین کرتے ہوئے کہتا ہے کہ پہلے تو اپنی ذات کو پہچان لے، اپنی خودی کے اسرار کو پالینے کے بعد اس خودی کو ذات حق میں فنا کردے، تاکہ تجھے بقائے دوام حاصل ہو:

ای مظہر سر خدا، وی طالب ملک بقاء   اول بخود شو آشنا، تا از خودی گردی فنا

اے انسان تو اسرار حق کا مظہر ہے اور اگر تو بقائے دوام کا طلب گار ہے تو پہلے اپنی ذات سے آشنا ہوجا، تاکہ اس نفس کو فنا فی اللہ کرکے بقا باللہ حاصل کرسکے۔

ولی نے ایک اور جگہ اسرار خودی کے عرفان کے لیے باطن کی جانب متوجہ ہوکر دل کے آئینہ میں تجلیات حق کا مشاہدہ کرنے کی ترغیب دی ہے۔

ازتن بجان نظر کن در جانِ جاں گذر کن   خود را ز خود خبر کن یعنی زخود بخود آ

اس ظاہری شکل سے گذر کر باطن کی جانب اپنا رخ کر اور اپنی ذات میں سیر کر، خود کو اپنے آپ سے آگاہ کر یعنی اپنے نفس سے اپنی ذات کی جانب آ اور اپنے آپ سے آشنا ہو۔

عشق کے کوچے میں عقل وخرد کا کوئی گذر نہیں ہوتا، عشق کا محرم تو صرف دل ہے، جو جام الست سے ایسا مسرور ہوا کہ اس کی محویت ابد تک باقی رہے گی اور عشق کی یہی سرشاری قرب الٰہی کا واحد ذریعہ ہے، عشق کی توصیف کے ساتھ ساتھ ولی کے ہاں عقل وخرد کی آستانۂ حق تک نارسائی کا بھی بیان ملتا ہے، چنانچہ وہ کہتا ہے:

با عقل وعشق نسبت خاشاک وآتش است   جز دل نگشت ہیچ کسی ہم زبان عشق

عشق کے ساتھ عقل کا وہی رشتہ ہے جو کہ آتش کے ساتھ تنکہ کا، عشق کا ایک ہی شعلہ عقل کو تنکہ کی طرح بھسم کردیتا ہے، سوائے دل کے عشق کا ہمراز اور محرم کوئی اور نہیں۔

در رہِ عشق کہتر از موری   جم عقل و سکندر ادراک

عشق کی راہ میں عقل اور ادراک کی دنیا کے جمشید اور سکندر جیسے عظیم سورما بھی ایک چھوٹی سی

چیونٹی سے بھی حقیر ہیں کیونکہ اس راہ میں عقل کے لاؤ ولشکر کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے، سب بیکار ہیں۔

ایک اور جگہ ولی کہتا ہے کہ جام وحدت سے وہ سرور حاصل ہوتا ہے کہ خردمندانہ عقل کی باتیں لایعنی معلوم ہوتی ہیں اور جو وحدت حق سے آشنا ہو جائے وہ اس بحث و مباحثہ سے اپنے آپ کو دور کر لیتا ہے۔

ساقی بیار بادۂ توحید تا دمی　　از قیل و قال ہستی خاموشی آورد

اے ساقیٔ حقیقی بادۂ توحید پلا دے، تاکہ کچھ لمحے تری وحدت کے نظارہ میں گم ہو جاؤں اور اپنی ہستی کے قیل وقال سے چھٹکارا پالوں اور چپ ہو جاؤں۔

ولی کی فارسی غزلیات کا موضوع بنیادی طور پر تصوف ہے، اس کی غزلوں میں تصوف کی مخصوص روایت اپنی تمام ہمہ گیری کے ساتھ رونما ہے، اس کے کلام میں سلاست اور متانت پائی جاتی ہے، لطف زبان، طرز ادا کی سادگی اور تصوف کی چاشنی اس کے اشعار کی ممتاز خصوصیات ہیں، ولی نے انسان دوستی، آزادخیالی اور صلح جوئی جیسے حکیمانہ اور اخلاقی مضامین میں بھی بڑی ہی شیریں و سادہ غزلیں کہی ہیں جو شاعر کی آزادفکر اور بلند خیالی کی غماز ہیں، ملاحظہ ہو:

بروز کوچۂ اسلام و کفر بر در صلح　　برات نقد چنیں ثبت شد بہ دفتر صلح
تعصّبات مذاہب تمام بے خردیست　　شنیدہ ایم بسمع رضا ز مخبر صلح
نگوئمت کہ فرنگی و یا مسلماں باش　　بہر طریق کہ باشی مباش منکر صلح
رسد بہ منزل تحقیق چوں ولؔی آں کس　　دہند عنانِ ارادت بہ دست رہبر صلح

ایک اور مختصر بحر کی غزل ملاحظہ فرمایئے:

من نہ پیرم نہ مریدم بابا　　پس ازیں قید رہیدم بابا
عین او یافتہ ام اشیاء را　　پردۂ شرک دریدم بابا
دین دنیا و دل و جاں دادم　　وحدت حرف خریدم بابا
سوای ایں کہ می بینم ولؔی را　　بسی ہنگامہ در پیش دیدم بابا

اخبار علمیہ

ملک کے نامور اور فعال تعلیمی ادارے ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کے کار خیر میں یہ بھی ہے کہ وہ ہر نئے تعلیمی سال میں طلبہ کو بہ طور قرض وظیفے دیتی ہے، اس سال میٹرک کم از کم ۸۰ فی صد اور انٹر یا اس کا مساوی امتحان ۷۵ فی صد اور گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کم از کم ۷۰ فی صد نمبروں سے پاس کرنے والے مسلم طلبہ و طالبات سے درخواست طلب کی گئی ہے، جو بچے اپنی اپنی ریاستوں میں سب سے زیادہ نمبر پانے والے ہوں گے ان کو دسمبر ۲۰۰۹ء میں سوسائٹی کے خرچ پر دہلی بلایا جائے گا، دو دن کے قیام میں انگریزی اور عام معلومات کے امتحان اور انٹرویو کے بعد وظیفوں کا فیصلہ ہوگا، وظائف کی رقم بالترتیب ۳۵۰، ۵۵۰، ۸۰۰ اور ۱۲۰۰ روپے ہوگی، ایک بانڈ بھرنا ہوگا جس سے رقم کی واپسی متعین ہو سکے گی، ۱۹۸۶ء سے اب تک ۴۹۳ بچوں کو یہ سہولت مل چکی ہے، خواہش مند طلبہ اس سلسلے میں جامعہ ہمدرد کی ویب سائٹ ڈبلو ڈبلو ڈبلو جامعہ ہمدرد: ایجو سے درخواست فارم ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں یا سکریٹری ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، تعلیم آباد، سنگم وہارنئی دہلی ۱۱۰۰۶۲ کو خط لکھ کر فارم حاصل کر سکتے ہیں، آخری تاریخ ۱۹/ستمبر ۲۰۰۹ء ہے۔

عرب کی ایک کمپیوٹر کمپنی شرکتہ العریس لکمبیوتر نے المرجع الاکبر للتراث الاسلامی کی سی-ڈی کا دوسرا حصہ بازار میں پیش کر دیا ہے، اس میں تفاسیر، علوم القرآن، متون حدیث، شروح الحدیث، علوم الحدیث، تراجم، رجال، فقہ حنفی، فقہ مالکی، فقہ شافعی، فقہ حنبلی، فقہ ظاہری، اصول فقہ، فقہ المقارن، فقہ القضاء، تاریخ، سیرت نبوی، لغات عربی، ادب عربی، معاجم عربی، شعر عربی کے تحت الگ الگ موضوع پر ۱۲/ہزار کتابیں ہیں، اس سی-ڈی کے ساتھ ایک مکمل فہرست بھی ہے۔

چند ہفتہ قبل اسلام آباد میں عالمی بنک کی عمارت میں بنگلہ دیش کے دو مصوروں تاج الدین اور افتخار احمد کے فن پاروں کی نمائش ہوئی، چالیس سے زائد ان فن پاروں میں بنگلہ دیش کی تاریخی و تہذیبی و ثقافتی زندگی اور معاشرے کے مختلف پہلوؤں حتیٰ کہ تانگے نما سائیکل رکشہ تک کی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے، اس کا افتتاح بنگلہ دیش کے ہائی کمشنر نے کیا، تاج الدین گزشتہ ۳۹/برس سے اس

مصوری سے وابستہ ہیں اور امریکہ، آسٹریلیا سمیت دنیا کے متعدد ممالک میں اپنے فن کی نمائش کر چکے ہیں، افتخار احمد نے بھی فرانس میں مصوری کی تعلیم حاصل کی ہے، دونوں کا خیال ہے کہ فن مصوری گو جمود کا شکار ہے لیکن جدت کی تلاش جاری ہے، ان کی تصویریں اسی کوشش کا سلسلہ ہیں۔

مصر کے خبر رساں ادارے مینا کے مطابق مفتی علی جمعہ نے اپنے فتوی میں جوہری اسلحہ کے استعمال کو غیر اسلامی قرار دیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ جوہری اسلحے صرف دوسروں کے استعمال سے باز رکھنے کے لیے رکھے جاسکتے ہیں، انہوں نے مزید کہا کہ اس طرح کے اسلحہ کا استعمال اسلام کے حربی اصولوں کے خلاف ہے کیوں کہ ان سے انسانی جانوں کی عام ہلاکت ہوتی ہے جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔

ترکی کی کل ۷۰ رملین کی آبادی میں ۱۲ رسے ۱۴ رملین کرد ہیں، کردوں کی کثیر آبادی کا خیال کرتے ہوئے وہاں کی مذہبی وزارت نے قرآن مجید کا کرد زبان میں ترجمہ کرانے کا منصوبہ تیار کیا ہے، کردوں کی سیاسی رنجش اور ترکی حکومت سے بے اطمینانی اور اپنی زبان سے غیر معمولی عصبیت اور ترکی زبان سے بے توجہی کے باوجود ترکی حکومت کا کہنا ہے کہ ہم کرد مسلمانوں کو ختم کرنا نہیں چاہتے، قرآن مجید کے کردی زبان میں ترجمے کا اہتمام، کردوں کو قریب لانے کی مبارک کوشش ہے۔

پٹنہ سے تعلق رکھنے والی رشیدہ خاتون جب روتی ہے تو اس کی آنکھوں سے پانی کی جگہ خون بہتا ہے، پھر بھی اس کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوتی، عام لوگ اس کو کرشمہ مانتے ہیں اور ڈاکٹر اس کی سائنسی وجہ بتانے سے قاصر ہیں، اس طرح خون کے آنسو رونے کے محاورہ کو حقیقت میں دیکھنے کے لیے ہزاروں لوگوں کا تانتا لگا رہتا ہے، رشیدہ نے عملاً یہ تو ثابت کردیا ہے کہ وہ ایسے لہو کی قائل نہیں جو صرف رگوں میں دوڑے پھرے لیکن یہ نہ معلوم ہوسکا کہ یہ شروع سے ہے یا پھر یہ عمل اچانک شروع ہوا۔

ٹیوبنجن یونی ورسٹی کی تحقیقاتی ٹیم نے ان تین بانسریوں کی تفصیلات شائع کی ہیں جو جرمنی کے جنوب مغربی علاقے بولبا فیلس کے غاروں سے ملی تھیں، یہ غار ابتدائی انسانوں کی موجودگی اور زندگی گزارنے کی جدوجہد کے آثار کے حوالے سے معروف ہیں، ان تین بانسریوں میں سے ایک

بیس سنٹی میٹر لمبی ہے اور اس میں تقریباً یکساں فاصلہ پر پانچ سوراخ بنائے گئے ہیں اور آخری حصہ انگریزی حرف V کی شکل میں تراشا گیا ہے، جن بانسریوں کی تفصیلات جاری کی گئی ہیں ان میں ایک گدھ کے پروں میں پائی جانے والی ہڈیوں سے بنائی گئی ہے اور دوسری دو ہاتھی دانت کی بنی ہوئی ہیں، محققین کا خیال ہے کہ ان بانسریوں کا تعلق ۳۵ ہزار برس قبل اس زمانے سے ہے جب انسانوں نے یورپ کے خطہ کو آباد کرنا شروع کیا تھا۔

اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق ناقص منصوبہ بندی، ماحولیاتی تباہی اور موسم میں تبدیلی سے یہ دنیا کسی بڑے المیہ کا شکار ہوسکتی ہے، ممکنہ خطرات کی بروقت اور مناسب نشان دہی نہ کیے جانے سے لاکھوں انسانوں کی زندگیاں خطرے میں پڑ سکتی ہیں، رپورٹ کے مطابق چند برس قبل سنامی اور گزشتہ برس چین میں آنے والے زلزلے تو قدرتی آفتیں تھیں لیکن گلوبل اسسمنٹ آن ڈزاسسٹر رسک ریڈکشن ادارہ کا کہنا ہے کہ اس ہولناک اور نہایت تباہ کن قدرتی آفات کے خطرے کو کم کیا جاسکتا ہے، اقوام متحدہ کی معاون خاتون سکریٹری کا بیان ہے کہ بڑی وجہ یہ لاعلمی بھی ہے کہ ماحولیاتی تبدیلی شہروں اور قصبوں پر کس قسم کے اثرات ڈال سکتی ہے۔

اٹلی کے شہر وینس میں دنیا کی سب سے بڑی آرٹ نمائش کا اہتمام کیا گیا ہے، اس کو آرٹ کی دنیا کے اولمپکس سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس میں آرمینیا سے وینیز ویلا تک تقریباً ستر ممالک حصہ لے رہے ہیں، اس نمائش میں اول آنے والے کو دی گولڈن لائن نامی انعام دیا جائے گا۔

ترکی کے ایک شخص Ozence Sonar نے روشن دھاگوں سے ایک جائے نماز تیار کی ہے، اس ایجاد نے ایک بین الاقوامی نمایش میں حاضرین کو بہ طور خاص اپنی جانب متوجہ کیا ہے، اس جائے نماز کو اس انداز سے بنایا گیا ہے کہ جائے نماز جس قدر قبلہ کی سمت ہوگی اسی قدر ان دھاگوں کی روشنی میں اضافہ ہوتا جائے اور مکمل طور پر قبلہ رو ہونے پر یہ پوری طرح روشن ہوجائے گی، اس ایجاد سے بہت حد تک سمت قبلہ معلوم کرنے کی دشواریوں کے امکانات کم ہوجائیں گے۔

ک،ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

مکتوب علی گڑھ

حبیب منزل، میرس روڈ،
علی گڑھ- ۲۰۲۰۰۲۔
۲۸/مئی ۲۰۰۹ء

مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مئی ۲۰۰۹ء کے معارف میں محمد ارشد صاحب کا مقالہ اسلامی ریاست : ایک تاریخی جائزہ بہت پسند آیا، انہوں نے بجا طور پر ثابت کیا ہے کہ حیات نبوی (ﷺ) کے مدنی دور (دس سال) اور خلافت راشدہ (۳۰ سال) کے بعد خلافت علی منہاج النبوۃ کا خاتمہ ہو گیا اور اس کی جگہ ملوکیت نے لے لی، اس کے بعد تا امروز یہ دور پھر کبھی واپس نہیں آیا، خلافت علی منہاج النبوۃ کا پہلا اصول خلیفہ کا ''جمہور مسلمانوں کی رضا و رغبت سے......انتخاب'' تھا، اس کی جگہ وراثت نے لے لی، دوسرا اصول ''مملکت سے متعلق......انتظامی وسیاسی فیصلوں کے لیے شوریٰ'' کا طریقہ، اب فرماں روا کا حکم واجب التعمیل قرار پایا، انہوں نے لکھا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے خود اعلان فرمایا تھا کہ میں ''اولین اسلامی بادشاہ ہوں''، اس کے بعد ہمیشہ بادشاہت رہی یا چند صدیوں کے بعد بعض ممالک میں اس کی جگہ آمریت نے لے لی، دونوں کا مطلب واحد ہے یعنی مطلق العنانی، یہاں میں ایک امر کا اضافہ کرنا چاہوں گا، خلافت علی منہاج النبوۃ میں شوریٰ سے بھی اوپر قرآن وسنت کا درجہ تھا یعنی خلیفہ کوئی ایسا مشورہ قبول نہیں کر سکتے تھے جو قرآن وسنت سے معارض ہو، ساتھ ہی ارکان شوریٰ بھی اس پر نظر رکھتے تھے کہ خلیفہ قرآن وسنت کی مکمل پیروی کر رہے ہیں یا نہیں، بادشاہت اور آمریت میں کوئی کسی کی نگہبانی کرنے والا بھی نہیں ہوتا ہے، اس کے باوجود محمد ارشد صاحب نے بعد کی مسلم حکومتوں کے لیے بھی اسلامی حکومت ہی کی اصطلاح

استعمال کی ہے،اس سے ان کا مطلب شاید یہ ہے کہ یہ سلاطین جو اپنے کو خلیفہ کہتے تھے، بہر حال اپنی مملکت میں شرعی قوانین کا نفاذ کرتے تھے اگر چہ انہوں نے بعد میں تسلیم کیا ہے کہ اس نفاذ میں بھی اجتماعیت نہیں رہی تھی بلکہ انتشار رونما ہوگیا تھا،اجتہاد (قیاس) اور اجماع کی جگہ مختلف فقہاء اور قضاۃ اپنی اپنی صواب دید کے مطابق شرعی قوانین کی تعبیر وتشریح اور ان کا نفاذ کرتے تھے،اس پورے دور میں واحد مثال اموی خلیفہ حضرت عمرؓ بن العزیز کی ہے جنہوں نے شرعی قوانین کا خود اپنے پر اور اپنے اہل خانہ پر کیا ورنہ خلیفہ (بادشاہ) اور شاہی خاندان بالعموم ان قوانین کے نفاذ سے ماوراہی رہتے تھے،تاہم حضرت عمرؓ بن العزیز بھی خلافت میں وراثت کو ختم کر کے جمہوریت کو بحال نہیں کر سکے، یہاں مراد آج کی جمہوریت نہیں ہے بلکہ وہ جمہوریت ہے جو خلافت علی منہاج النبوۃ کے دور میں پائی جاتی تھی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جو صورت حال محمد ارشد صاحب نے بیان کی ہے اس کی موجودگی میں خلافت راشدہ کے بعد کی حکومتوں کو اسلامی حکومت کہنا کیسے درست ہوسکتا ہے؟ اسے تو عام مسلمانوں کی حکومت کہنا بھی دشوار ہے،وہ کسی مسلم خاندان کی حکومت ہوتی ہے یا پھر اسے مطلق العنان فرماں روائی حکومت کہنا چاہیے جو اتفاق سے مسلمان ہوتا ہے۔

نیازمند
ریاض الرحمان شروانی

مکتوب بنارس

CK46/30-b, 3rd Floor
Benia Bagh, VARANASI
(221001)
۲۷/جون ۲۰۰۹ء

مکرمی! سلام مسنون

''معارف'' کا تازہ شمارہ بابت ماہ جون ۲۰۰۹ء کل موصول ہوا، شاہ ظفر الیقین صاحب کے مضمون ''سر شاہ محمد سلیمان مرحوم'' کے ایک بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سر شاہ سلیمان

نے فروری ۱۹۴۱ء میں مسلم یونی ورسٹی کے ایک جلسے میں شرکت کر کے دہلی پہنچنے کے بعد اسی روز لالہ سری رام مصنف خم خانۂ جاوید کے ہاں ایک دعوت میں شریک ہوئے تھے (۴۴۳)، یہاں فاضل مضمون نگار کو سہو ہوا ہے، لالہ سری رام مولف خم خانۂ جاوید اس سے دس سال قبل ۲۵/مارچ ۱۹۳۰ کو انتقال کر چکے تھے، یہاں جن لالہ سری رام کا نام آیا ہے، وہ مولف خم خانۂ جاوید کے ہم نام و ہم عصر دہلی کے ایک اور رئیس تھے جو آزادی کے کئی سال بعد تک زندہ رہے، یہ عجب اتفاق ہے کہ ان کے والد کا نام بھی لالہ مدن گوپال تھا۔

محترم ظلی صاحب و دیگر رفقائے کار کی خدمات میں سلام عرض ہے، امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

مخلص

حنیف نقوی

مکتوب اعظم گڈھ

نسواں انٹر کالج،
محلّہ پہاڑ پور، اعظم گڈھ
۳۰/جون ۲۰۰۹ء

مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سر شاہ سلیمان مرحوم پر میرے مضمون کی اشاعت کے لیے شکریہ، یہ میرا پہلا مضمون ہے اور خدا کا شکر ہے کہ اس کو معارف کے صفحات میں جگہ ملی، البتہ شاید بدخطی اور صفحات کے زیر عکس (زیراکس) ہونے کی وجہ سے چند تسامحات رہ گئے ہیں، ان کی تصحیح ضروری ہے، اپریل کے معارف صفحہ ۲۷۷ میں ''نائب صدر اردو کلکتہ میتھمیٹیکل سوسائٹی'' میں لفظ اردو، زائد ہے، اسی صفحہ کی آخری سطر میں ''سلطان عزالدین میمن سلطان سلیمان'' میں میمن کی جگہ ''بن'' ہونا چاہیے، صفحہ ۲۷۸ پر شاہ کامل کی جگہ شاہ کابل صحیح ہے، اسی صفحہ کی سطر ۹ میں ملا محمد کی جگہ ملا محمود ہونا چاہیے، صفحہ ۲۸۶ سطر ۵ میں بارایٹ لا کی جگہ ''لالال'' چھپ گیا ہے، سطر ۱ پر ''تیز تھی'' کو تیزی تھی پڑھا جائے،

آ گے سطر ۱۵ پر ۵ ہزار کی جگہ ۱۵ ہزار ہونا چاہیے، سطر ۱۹ پر صاحب زادوں غلط ہے، صاحب زادہ صحیح ہے، صفحہ ۱۸۵ سطر ۲۰ پر درندگی کو زندگی لکھ دیا گیا ہے، صفحہ ۱۹۰ سطر ۱۸ پر آل انڈیا صدر کو آل انڈیا مسلم ہونا چاہیے، سطر ۱۹ میں اجمیر کی جگہ یکم ستمبر ہو گیا ہے، صفحہ ۱۹۱ سطر ۱ پر نائب نہیں نائٹ درست ہے۔

مئی کے معارف میں صفحہ ۲۷۲ سطر ۵ پر محمد یہ کی جگہ مجید یہ درست ہے، صفحہ ۲۷۳ سطر ۴ پر شمس البازغہ کی جگہ شمس بازغہ پڑھا جائے۔

جون کے معارف صفحہ ۴۳۷ سطر ۶ ''پر آتے جاتے تھے'' میں جاتے زائد ہے، سطر ۱۶ پر ''یہیں سلیمان'' کہ جگہ لیڈی سلیمان اور صفحہ ۴۳۹ سطر ۹ میں ۱۹۲۸ء کی بجائے ۱۹۳۸ء ہونا چاہیے۔

والسلام
شاہ ظفر الیقین

مکتوب چمپارن

کاشانۂ ادب، سکٹا دیوراج
مغربی چمپارن (بہار)۔

محترمی جناب مولانا کلیم صفات اصلاحی صاحب
السلام علیکم

مولانا مرحوم کے تقریباً ۵۳ خطوط میرے پاس محفوظ ہیں، اگر دارالمصنفین یا ان کا کوئی عزیز وقدرداں ان کے خط شائع کرنا چاہتے ہوں تو مطلع فرمائیں کہ ان خطوط کا عکس ان کو ارسال کردوں۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ تو ہمیشہ کے لیے ہماری نگاہوں سے روپوش ہو گئے ہیں لیکن ان کی یادیں لوح دل پر اس طرح نقش ہیں کہ وہ مٹ نہیں سکتیں۔

والسلام
مخلص
وارث ریاضی

وفیات

آہ، مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی مرحوم

علامہ ابومحفوظ الکریم معصومی نے ۱۷/جون ۲۰۰۹ء کو اس عالم فانی کو الوداع کہا اور کلکتہ کی زمین نے علم و تحقیق کے آسمان کو اپنی آغوش میں لے لیا، یقیناً ان کی وفات سے مطالعہ و تحقیق کی دنیا میں عرصے تک خلا محسوس کیا جائے گا، فنا فی العلم ہستیاں اب نایاب ہیں اور ان کے اٹھ جانے سے واقعی علم کے اٹھ جانے کا احساس ہوتا ہے۔

دارالمصنّفین سے ان کا تعلق نصف صدی سے زیادہ کی مدت پر محیط ہے، وہ جب ڈھاکہ یونی ورسٹی میں ریسرچ اسکالر تھے تو اس وقت یعنی ۱۹۴۸ء میں ان کا مضمون ''تفسیر طبری کی اہمیت'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا، یہ تعلق اس طرح قوی سے قوی تر ہوتا گیا کہ وہ آخری وقت تک رسالہ ''معارف'' کی مجلس ادارت اور دارالمصنّفین کی مجلس انتظامیہ کے رکن رہے، اس لیے دارالمصنّفین میں ان کے رحلت کی خبر اور بھی زیادہ غم و اندوہ کے ساتھ سنی گئی۔

مولانا کی زندگی کا بیشتر حصہ بنگال میں گزرا لیکن اصلاً مولد و وطن صوبہ بہار کا نہایت مردم خیز قصبہ بہار شریف ہے، ان کے والد مولانا محمد امیر حسن نے کلکتہ اور ڈھاکہ میں مدۃ العمر تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دیے لیکن وطن کی خاک ان کو بہار شریف کھینچ لائی، مولانا محمد امیر حسن کے دو صاحب زادے ہوئے اور دونوں علم و تحقیق کے آفتاب و ماہتاب نکلے، ایک تو ڈاکٹر محمد صغیر حسن معصومی، جنھوں نے آکسفورڈ یونی ورسٹی سے ابن باجہ اندلسی کی کتاب النفس کو مرتب کرکے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی، ان کے بعض مقالے معارف میں شائع ہوئے، پاکستان بننے کے بعد وہ وہاں کے تعلیمی اداروں سے وابستہ ہوئے اور اسلام آباد میں ۱۹۹۶ء میں وفات پائی، ہمارے مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی ان سے چھوٹے تھے، ان کی تعلیم میں والد صاحب کے علاوہ صغیر حسن معصومی کی توجہ بھی شامل رہی، ان کے علاوہ ان کے اساتذہ میں مفتی عمیم الاحسان مجددی، سید ولایت حسین بیربھومی، مفتی محمد شفیع حجۃ اللہ فرنگی محلی انصاری، علامہ عبدالرحمان کاشغری جیسے نامور علما بھی ہیں، تعلیم کی تکمیل کے ساتھ ہی مولانا معصومی نے مدرسہ عالیہ کلکتہ سے درس و تدریس کا آغاز کیا اور مسلسل اس

محنت و دیانت سے معلّمی کے فرائض انجام دیے کہ حکومت ہند نے ان کو عربی زبان کے بہترین استاذ کی سند سے نوازا، سبکدوش ہوئے تو مغربی بنگال کے وقف بورڈ اور اردو اکیڈمی کے چیرمین بنائے گئے اور ۱۹۹۱ء میں ان کو صدر جمہوریہ نے عربی زبان و ادب کی مجموعی خدمات کے اعتراف میں سند توصیف سے بھی سرفراز کیا، دنیاوی اعزاز و عہدے اور بھی ملے لیکن یہ اعزاز ہوں یا سرکاری ملازمت یا کلکتہ کے امام عیدین کا منصب کوئی بھی طلب علم اور تحقیق کی رہ نوردی میں حائل نہ ہوسکا، ان کی تحریروں کا بڑا حصہ عربی زبان میں ہے، اردو میں بھی ان کی نگارشات کا زیادہ تر موضوع عربی ادب ہی رہا، مخطوطات کی تحقیق، ترتیب اور تعلیق سے ہمیشہ دلچسپی رہی، شرح الالفات لابن انباری، مسئلہ صفات الذاکرین والمتفکرین، القول المسموع فی الفرق بین الکوع والکرسوع، ارجوزتاں مطبوعہ کتابیں ان کی مخطوطات شناسی کی شاہد ہیں، ان کے علاوہ معلوم ہوا کہ نسب قریش اور کتاب التعلیقات والنوادر دو مرتبہ مخطوطے ابھی غیر مطبوعہ ہیں، ان کے عربی مقالات و مضامین کا ایک مجموعہ بحوث وتنبیہات کے نام سے دو جلدوں میں بیروت سے شائع ہوا ہے، ان کے تین عقیدت مند نوجوان فضلا ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی، محمد عزیر شمس اور مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی کو اس کی ترتیب اور طباعت و اشاعت کی سعادت ملی، اس میں ابوجعفر المصادی، ابوعلی الہجری، قدامہ بن جعفر، شرف الدین البوصیری، صدرالدین الشیرازی وغیرہ کے علاوہ خسرو و غالب کی شاعری کا عربی زبان میں تعارف کرایا ہے۔

مطالعہ کی وسعت اور مضامین کے استحضار اور نظر کی گہرائی کی وجہ سے علمی تسامحات پر ان کا نقد و تبصرہ بھی ان کی بڑی خصوصیت ہے، اردو میں بھی ان کے اس قسم کے مقالات و مضامین اگر شمار کیے جائیں تو شاید یہ سینکڑوں میں ہوں، ابن جریر طبری سے غالب تک ان مضامین سے ان کے علم کی بے کرانی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، یہاں ابن جریر طبری والے مضمون کے متعلق یہ کہنا بے محل نہیں کہ معارف میں ان کا یہ مضمون اس وقت چھپا جب وہ ۱۶-۱۷ سال کے تھے، اس نوعمری کے باوجود یہ مضمون اتنا مکمل تھا کہ مولانا عبدالماجد دریابادی اور دیگر اکابر نے ان کو خط لکھ کر مبارک باد دی، ۱۹۴۸ء میں تفسیر طبری کی اہمیت اور اپریل ۱۹۴۹ء میں معانی القرآن للطبری جیسے مقالات کے لکھنے والے کے متعلق یہ تصور بھی آج محال ہے کہ یہ کسی ۱۷-۱۸ سالہ طالب علم کے قلم

سے ہیں، ان کو ترجمہ نگاری پر بھی پوری قدرت تھی، معارف میں ان کے مضمون ''کنٹالث بلنثیا'' کو مثال میں پیش کیا جاسکتا ہے، گذشتہ صدی میں اسپین کے اس نامور عرب شناس کو سب سے پہلے معصومی صاحب نے معارف کے ذریعہ اردو دنیا سے روشناس کرایا۔

عربی اور اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی ان کے مضامین شائع ہوتے رہے، درس و تدریس اور دوسرے قومی امور کی انجام دہی کے ساتھ ان کے وقت اور کام میں یہ برکت واقعی غیر معمولی ہے، علمی و تعلیمی اداروں سے تعلق کو بھی وہ نباہتے رہے، دارالمصنّفین کے ساتھ وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، مدرسۃ الاصلاح، ایشیاٹک سوسائٹی اور ایران سوسائٹی کے رکن تھے، ندوہ میں انہوں نے کئی لکچر دیے، ان کی عبقریت تھی کہ وہ شعروسخن کا نہایت اعلا ذوق رکھتے تھے، سخن گو تھے اور نثر کی طرح شعر بھی تینوں زبانوں یعنی عربی، فارسی اور اردو میں کہتے تھے، مولانا سید سلیمان ندویؒ کی مشہور نعت و مناجات کی انہوں نے جس طرح تخمیس کی وہ ان کی قدرت کلام کا بہترین نمونہ ہے۔

رسوخ فی العلم اور شرق و غرب میں مقبولیت، دنیوی اعزازوں کی کثرت کے ساتھ تواضع، کسر نفسی اور خاکساری کی دولت بھی خوب ملی تھی، اپنے چھوٹوں سے بھی وہ شاخ ثمر بار کی طرح جھک کر ملتے اور اپنی خوش مزاجی و خوش گفتاری سے پندار علم کے تمام حجابوں کو اٹھا دیتے، اس خاکسار نے آخری بار کلکتہ میں ان کے دولت کدہ پر حاضری دی تھی، اس دولت کدے کا کیا حال بیان کیا جائے، ہمارے متقدمین علما و صوفیہ کے تذکروں میں، زہد، سادگی، استغنا اور دنیوی زیب و زینت سے نفور کی ساری داستانیں ہم نے ان کے اس چھوٹے سے کمرے میں دیکھ اور پڑھ لیں، جہاں ایک معمولی چارپائی کے چاروں طرف صرف کتابیں تھیں، یہی دیوان خانہ اور یہی خواب خانہ بھی تھا۔

مولانا کی زندگی بیرون کی طرح اندرون میں بھی یکساں تھی، یہ جملہ بظاہر عام سا ہے لیکن جو مولانا مرحوم کو ذرا بھی قریب سے جانتے ہیں، ان کی نظر میں وہ سارے مصائب اور آزمائشیں بھی ہیں جن پر مولانا کے صبر کو شاید صبر ایوبی کہنا زیادہ مبالغہ نہیں، وہ مسلسل درد پر درد سہتے رہے لیکن ان کے چہرے اور گفتگو سے کرب کا اندازہ کم لوگوں کو ہوسکا، وہ یقیناً قیامت کے دن ان خوش بختوں میں ہوں گے جن کے صبر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور نوازشوں اور حقیقی راہ یابی کا وعدہ ہے، اولئك عليهم صلوات من ربهم ورحمة واولئك هم المهتدون ۔ ع-ص

ادبیات

غزل

(حضرت حفیظ جالندھری مرحوم کی نذر)

جناب وارث ریاضی صاحب

(۱)

سماں ہے بہاروں کا ، رُت ہے سہانی ‌ ‌ ‌ پلائے جا ساقی ! مئے ارغوانی
سبو بھی پرانا ہے ، مئے بھی پرانی ‌ ‌ ‌ نئی لذتِ مئے ، نئی شادمانی
چمن کی بہاریں ، خوشی کا زمانا ‌ ‌ ‌ نہ یہ دائمی ہے نہ وہ جاودانی
نہ ہو جس میں سوز و گداز محبت ‌ ‌ ‌ وہ کیسی جوانی ہے ؟ کیا زندگانی ؟
ازل ہی سے چشم تمنا ہے حیراں ‌ ‌ ‌ مگر فطرتِ حسن ہے لن ترانی
وہ فرہادِ شیریں ہو یا قیسِ لیلا ‌ ‌ ‌ ملی ہے کسے عشق میں کام رانی ؟
بنایا کیا نقش پانی پہ یارب ! ‌ ‌ ‌ گنوائی ہے کارِ عبث میں جوانی
اشارات و الفاظ سب تھک گئے ہیں ‌ ‌ ‌ ترے غم کی دشوار ہے ترجمانی
فراوانئ زر پہ اترانے والو ! ‌ ‌ ‌ کسی کی نہیں ہے یہ دنیاے فانی
یہ اردو ہے وارث محبت کی بولی ‌ ‌ ‌ محبت کی بولی ہے ہندوستانی

غزل

(۲)

نہ جانے یہ کیسی بلا ہے جوانی ‌ ‌ ‌ کہ سارے جہاں کو ہوئی بدگمانی
عجب تیری طرزِ نگارش ہے یارب ‌ ‌ ‌ کہ تو جاوداں نقش ہستی ہے فانی
تسلط ترا میری فکر و نظر پر ‌ ‌ ‌ دبستانِ دل میں تری ضوفشانی
فریب نظر عالم رنگ و بو ہے ‌ ‌ ‌ فقط چند لمحوں کی ہے شادمانی
درِ دل پہ دی آج یہ کس نے دستک ؟ ‌ ‌ ‌ دمِ واپسیں اس قدر مہربانی
کبھی غور سے کاش ! سنتا زمانا ‌ ‌ ‌ محبت کا انجام میری زبانی
بڑا جان لیوا ہے تیرا تبسم ‌ ‌ ‌ بہت زہر آگیں ہے شیریں بیانی
ازل سے ہے اہلِ خرد کے دلوں پر ‌ ‌ ‌ تری زلفِ پُرپیچ کی حکم رانی
یہ میری ضعیفی ہے ، میری ضعیفی ‌ ‌ ‌ وہ میری جوانی تھی میری جوانی
اسیرِ مصائب ہوں وارث ریاضی ‌ ‌ ‌ مقدر میں شاید نہیں کام رانی

کاشانۂ ادب سکٹا دیوراج، ڈاک خانہ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن، بہار 845453۔

مطبوعات جدیدہ

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تحقیقات حدیث: از ڈاکٹر محمد عتیق الرحمان، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۲۰۸، قیمت درج نہیں، پتہ: شاہ ولی اللہ اکیڈمی، پھلت، مظفرنگر، یوپی اور مرکز تحقیقات اسلامی، نیوعظیم آباد کالونی، سنیچرا باغ، پٹنہ نمبر ۶۔

صحیح بخاری کی شرح وحواشی کی علمی خدمت، طبقۂ محدثین کے لیے شروع سے مایہ سعادت رہی ہے اور قیامت تک لکھی جائیں گی اس کی تفسیریں بہت، شاہ ولی اللہ دہلوی کی محدثانہ عظمت کے سلسلے میں عام طور پر موطا امام مالک سے ان کے غیر معمولی شغف اور مصفی ومسوی کو بطور مثال پیش کیا جاتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے بخاری کے منتخب ابواب پر رسالہ لکھ کر اور صحیح بخاری کی تدریس وتعلم کا اہتمام فرما کر صحیح بخاری سے اپنی شیفتگی ظاہر فرمائی، زیرنظر کتاب ایک اور ثبوت ہے جو شاہ صاحب کے انتقال سے اب تک گویا کنز مکنون کی طرح نظروں سے اوجھل تھا، یعنی بخاری شریف کا وہ نسخہ جس کو شاہ صاحب نے سامنے رکھ کر اپنے شاگردوں کو تعلیم دی تھی اور جس پر جابجا ان کے ایک شاگرد شیخ محمد بن پیر محمد الہ آبادی کے قلم سے شاہ صاحب کے افادات لکھے گئے ہیں، یہ نہایت قیمتی نسخہ خدابخش لائبریری کے ہزاروں مخطوطات میں گو محفوظ تھا لیکن شاہ صاحب کے حواشی وافادات سے ان کے معتقدین بھی لاعلم تھے، زیرنظر کتاب کے فاضل مولف جو چند سال قبل تک حصہ مخطوطات کے ذمہ دار تھے ان کی نظر سے یہ بیش قیمت جواہر حدیث گزرے اور انہوں نے ان کو نہایت سلیقے سے پہلے تو ایک مقالے کی شکل اور بعد میں زیادہ مفصل طریقے سے زیرنظر کتاب میں پروکر پیش کر دیا ہے، ان کے لیے واقعی نہایت مسرت بلکہ خوش بختی کی بات ہے کہ ان کے ذریعہ یہ نایاب تحقیقات دنیائے حدیث کے لیے عام ہوئی ہیں، فاضل مرتب اپنے تحقیقی ذوق کے لیے معروف ہیں، اس کتاب میں بھی ان کی یہ خوبی نمایاں ہے، متعلقہ ابواب اور

اس کے ذیل میں اصل حدیث، پھر شاہ صاحب کی تحقیق اور پھر خود مولف کی وضاحت اور سلیس اور سادہ اسلوب نے اس کتاب کو بہت نافع بنا دیا ہے، شروع میں اس نادر نسخہ بخاری کی خصوصیت واہمیت پر ان کا مضمون بھی بڑا قیمتی ہے جس میں سال کتابت کی تعیین، قرأت کی تعداد، شاہ عالم بادشاہ کا اس سے اعتنا اور اعراب لگانے کا حکم اور شاہ دہلوی کے دست مبارک سے لکھے ہوئے اجازت نامے کی تفصیل بیان کی ہے، مصنف اس سعی مبارک کے لیے اور پھلت کی شاہ ولی اللہ اکیڈمی اس کی اشاعت کے لیے قابل صد تحسین وآفرین ہے۔

نکتۂ ایماں کی تفسیریں: مرتب ڈاکٹر مسعودالحسن عثمانی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۱۶۸، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: مکتبہ دینی تعلیمی کونسل، عارف آشیانہ، چوک، لکھنؤ اور لکھنؤ کے دوسرے مکتبے۔

دینی تعلیمی کونسل یوپی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا تعلق اسی سے ظاہر ہے کہ مولانا ندوی قریب چالیس سال تک اس کے صدر رہے، کونسل کے اجتماعات میں ان کی تقریریں بقول مولانا دریابادی ''ایسی ہوتیں کہ گویا اپنا کلیجہ نکال کر مسلمانوں کے سامنے رکھ دیتے'' یہ تقریریں دراصل آزادی کے بعد کے ماحول اور حالات میں ہندوستانی مسلمانوں کے لیے روشنی کا مینار اور اسلامی تشخص اور تہذیب وتعلیم کی حفاظت و بقا وترقی کے لیے کامل منشور ہیں، ان تقریروں کا ایک بہترین مجموعہ تکبیر مسلسل کے نام سے کئی سال پہلے شائع ہوا، معارف میں اس کا ذکر بھی آیا، زیر نظر مختصر کتاب اسی تکبیر مسلسل کے فاضل مرتب کی ایک اور پیش کش ہے جس میں تکبیر مسلسل کے متعلق ملک کے ممتاز اہل قلم اور رسائل وجرائد کے تاثرات کو جمع کیا گیا ہے، یہ محض کسی کتاب پر سرسری اظہار خیال نہیں ہیں بلکہ ان میں کونسل کی اہمیت وافادیت اور بعض اور مسائل پر بھی گفتگو ہے اور اس کی بہترین مثال جناب سید حامد کا مضمون ہے جن کے نزدیک ''یوپی کے مسلمانوں نے اگر کوئی کام عہد آفریں کیا ہے تو وہ یہی تحریک ہے جس کے امکانات آج بھی ولولہ انگیز ہیں'' یہ اور دوسرے تاثرات و واقعات نکتۂ ایماں کی تفسیریں ہیں، فاضل مرتب نے خوب فرمایا کہ تکبیر مسلسل اور اس مجموعہ کے درمیان متن اور شرح کا تعلق ہے، ان دونوں کا مطالعہ دوچند

فائدہ کا ضامن ہے، مولانا سید واضح رشید ندوی کا پیش لفظ ان خوبیوں پر مستزاد ہے۔

حیات عبدالباریؒ: از جناب سید محمود حسن حسنی ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۳۸۴، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: مجلس صحافت ونشریات، ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

گذشتہ سو سال میں ہندوستان کے نمایاں ترین اہل علم کی اگر مختصر ترین فہرست بنائی جائے تو اس میں جن بزرگوں کا شمار ضروری ہوگا ان میں ایک مولانا عبدالباری ندوی کی شخصیت یقیناً شامل ہوگی، علامہ شبلیؒ کے فیضان نظر نے ان کو اہل نظر بنایا، صاحب الکلام اور علم الکلام کے اس شاگرد نے ندوے کی تعلیم وتربیت سے وہ مقام حاصل کیا کہ نظام حیدرآباد کے سامنے ان کا تعارف اس جملے سے کرایا گیا کہ ”ان کے ہاتھ پر فلسفہ، اسلام لایا ہے“ فلسفہ قدیم اور جدید کے وہ ان اسلامی جامعین میں سے ہوئے جن کے وجود سے غزالی ورازی کے علوم پر از سر نو ایمان کی تجدید ہوئی، ان کی باکمال شخصیت پر معاصرین ومتاثرین کے مضامین آئے لیکن ان کی ایک جامع اور مکمل سیرت کی ضرورت تھی اور یہ ضرورت اس کتاب کے نوجوان اور نہایت ہونہار مصنف نے گیارہ ابواب میں اس طرح پوری کی کہ مولانا ندوی کی زندگی کا کوئی بھی گوشہ اور پہلو تشنہ نہیں رہا، مصنف کی تحریر کی سادگی قابل داد ہے، کتابوں کے علاوہ انہوں نے مولانا ندوی کے اہل خاندان سے معلومات کے حصول میں بھی خاصی محنت کی ہے، مولانا کی کتابوں کے تعارف میں بھی اخذ واستناد کا سلیقہ نمایاں ہے۔

پنہاں چہرے: از ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۱۹۲، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: ساحل کمپیوٹرس، حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگ پور، مہاراشٹر۔

مولانا دریابادی، قاری طیب، مولانا علی میاں، محدث اعظمی، قاضی مبارک پوری، مالک رام، رشید حسن خاں، مشفق خواجہ اور ڈاکٹر عبدالرب عرفان جیسے مشاہیر کے ساتھ میکش ناگپوری، شارق ایرایانی، یونس قنوجی جیسے نسبتاً کم معروف بزرگ اور ان کے علاوہ متعدد شخصیتیں اس کتاب

کے پردے میں پنہاں بھی ہیں اور عیاں بھی، ساحل صاحب مشاق اہل قلم ہیں، ان کی کتابوں کی تعداد تیس کے قریب ہے، ان کے مطالعہ و تحقیق کا خاص موضوع دیکھا جائے تو ودربھ یا برار بلکہ ناگپور کی علمی و ادبی تاریخ نگاری ہے، وہ فارسی ادبیات کے بھی شائق و ماہر ہیں لیکن ان کو صاحبان فکر و نظر کے مطالعہ کی توفیق بھی ملی، یہ کتاب اسی توفیق کی گویا داستان ہے جو واقعی دلچسپ ہے اور تذکرہ نگاری کی پاکیزہ روایات کی خوب صورت کڑی ہے، بعض چہرے تو پنہاں نہیں ہیں لیکن ان کے ذکر میں خود لکھنے والے کی سادہ، مخلص اور معصوم تصویر ضرور سامنے آجاتی ہے جو بہتوں کی نظر سے پنہاں تھی، افسوس ہے کہ اس کتاب کا ذکر ان سطروں میں بڑی تاخیر سے ہو رہا ہے۔

فضا ابن فیضی، شخصیت اور فن: از ڈاکٹر حدیث انصاری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۳۶، قیمت ۱۲۰ روپے، پتہ: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

فضا ابن فیضی کی شاعرانہ عظمت کا زمانہ قائل ہے، غزل ہی نہیں اردو شاعری کی ہر صنف کی آبرو کا ان کو پاس تھا، یہ تہذیب اور شائستگی ان کو اس تعلیم اور ماحول سے ملی تھی جس کے لیے اعظم گڈھ کے خطہ مئو کو ایک زمانے سے امتیاز حاصل ہے، روایت کی قدر اور اپنے عصر کے لہجے کی اہمیت کو انہوں نے صحیح طور پر محسوس کیا اور اپنے ادبی اظہار میں اس خوبی سے برتا کہ وہ اردو شاعری کے نمایاں ترین نمائندوں کی صف میں شامل ہو گئے، ان کی شاعری اس لائق ہے کہ بار بار اس سے حظ و لطف کا اکتساب کیا جائے، ان کی شخصیت ان کی شاعری سے جدا نہیں، اس کتاب کے لائق مصنف نے اس فرض کی اہمیت کو سمجھ کر ایک ادبی قرض کو اتارنے کی اچھی کوشش کی ہے، انہوں نے پی ایچ ڈی کے لیے یہ مقالہ لکھا لیکن حق یہ ہے کہ یہ محض ڈاکٹریٹ کے مروجہ مقالوں سے کہیں زیادہ ایک ایسی مستقل و مکمل کتاب ہے جس میں مئو کی تاریخ، فضا کے خاندان، ان کے عہد اور ان کی شاعری پر معلومات کا خزانہ جمع کر دیا گیا ہے، ان کو ہمیشہ یہ احساس رہا کہ موثر ادب ہی اعلا ادب ہے، اسی احساس نے ان کے تجزیے کو معتدل اور متوازن رکھنے میں مدد کی، یہ کتاب فضا ابن فیضی مرحوم کی زندگی ہی میں شائع ہو گئی تھی، اب ان کے انتقال کے بعد یہ ان پر کام کرنے

والوں کے لیے عمدہ ماخذ ثابت ہوگی۔

سیکولرزم، بھارت اور مسلمان : از ڈاکٹر ابوذر کمال الدین، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۸۸، قیمت ۱۵۰، پتہ : اردو بک ریویو ۳/ ۱۷۳۹ (ذیلی منزل) نیو کوہ نور ہوٹل، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی نمبر ۲۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے وجود اور ان کے تشخص اور شناخت کے معاملہ میں ہندوستانی سیکولرزم کی بات ناگزیر ہے، اس کا مفہوم اصلاً کیا ہے، ہندوستان کے پس منظر میں اس کی معنویت کیا ہے، ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کے باب میں اس کی عملی تعبیر کیا ہے اور موجودہ حالات میں اس کی راہ میں کیسے کیسے مسائل ہیں؟ ان سوالات سے اس کتاب میں تعرض کیا گیا ہے، فاضل مصنف کی خوبیوں میں ان کے باشعور، جرأت مند، بے باک، ماہر معاشیات دانش ور ہونے کا ذکر کیا گیا ہے، کتاب کے مباحث ان خوبیوں کی تصدیق و توثیق کرتے نظر آتے ہیں، ان کے نزدیک اس وقت اقتدار کی جنگ علاقائی اور سماجی اعتبار سے ہے، مسلمان محض تماشائی ہیں لیکن اس تماشے سے ان کو کیا حاصل ہوسکتا ہے، اس سلسلے میں یہ فکر قابل تعریف ہے کہ اس ملک سے وفاداری، محبت، خدمت اور اس کی فلاح و بہبود کی فکر اصلاً اور عقیدتاً جتنی مسلمانوں کو ہوسکتی ہے اور وہ اس ذمہ داری کو جس ایمان داری سے ادا کرسکتے ہیں وہ علاقوں، زبانوں اور ذاتوں میں منقسم طبقے نہیں کرسکتے، اسی حقیقت کو پیش نظر رکھ کر مسلمانوں کو اس ملک کی تعمیر میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے، یہ بات بھی درست ہے کہ مسلمانوں کے مسائل اپنی جگہ صحیح ہیں لیکن اس کے ساتھ ہم کو ملک کے اور مسائل سے صرف نظر نہیں کرنا چاہیے، یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا کہ ہندوستان کے دستور پر اگر ایمان داری سے عمل کیا جائے تو اقلیتوں کو امن و عافیت کے علاوہ ملک کے تمام طبقات کے درمیان ایک بہتر سماجی رابطہ پیدا ہوسکتا ہے، کتاب اس لائق ہے کہ اس کو سنجیدگی سے پڑھا اور سمجھا جائے۔

ع-ص